طلوعِ اسلام

اکتوبر ۱۹۵۳

طلوعِ اسلام کا مسلک اور مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ

۱۔ تنہا عقل انسانی (عقل) زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اسے اپنی راہنمائی کیلئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔

۲۔ یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ اس لئے نوعِ انسانی قرآن کے بغیر اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔

۳۔ حق اور باطل کا معیار قرآن ہے۔ ہر روایت جو قرآن کے مطابق ہے صحیح ہے، جو اس کے خلاف ہے غلط ہے۔

۴۔ حضور نبی اکرم انسانیت کی بلند ترین عظمتوں پر فائز تھے لیکن مذہبی تعصب نے ہماری تاریخ میں بہت سی ایسی چیزیں شامل کر دیں جن سے حضور کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ ہماری تاریخ کا ایسا حصہ (خواہ وہ کسی کتاب میں ہو) یکسر غلط اور وضعی ہے۔ حضور کی سیرت کا صحیح معیار خود قرآن کریم ہے۔

۵۔ قرآن کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ اس برادری کے قیام کی عملی شکل یہ ہے کہ تمام دنیا ایک الٰہ العالمین کے مطابق زندگی بسر کرے۔

۶۔ اس عالمگیر تمدن کی تشکیل کی صورت یہ ہے کہ انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں۔ انہی قوانین کو شریعت کہا جاتا ہے۔ یہ جزئی قوانین زمانے کی تبدیلی کے ساتھ بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔

۷۔ اس کی رو سے قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہوتی ہے اور کوئی فرد معاشرہ بھی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ اسے ربوبیت عامہ یعنی تمام نوعِ انسانی کی پرورش کا ذمہ لینا کہتے ہیں۔

۸۔ ربوبیت عامہ کے مقصد عظیم کے حصول کیلئے قرآن کی رو سے ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کے بجائے معاشرے کی تحویل میں رہیں تاکہ رزق کی تقسیم ضرورت کے مطابق ہو سکے اور کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے۔ اسے قرآنی نظامِ ربوبیت کہا جاتا ہے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ پاکستان میں بتدریج یہ قرآنی نظامِ ربوبیت قائم ہو جائے تاکہ صحیفہ خداوندی کی روشنی میں انسان کی تمام مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو سکے اور اس طرح یہ زمین اپنے رب کے نور سے جگمگا اٹھے۔

اگر آپ قرآنی اسلام سے متعلق اس مسلک اور مقصد سے متفق ہیں تو آج ہی طلوعِ اسلام کا مطالعہ کیجئے

-/10/-

روز مرہ زندگی کے اہم
مسائل و معاملات کے متعلق

ہماری بصیرت کے مطابق

قرآنی فیصلے

دور حاضرہ کی عظیم الشان کوشش جس میں روزمرہ زندگی کے تقریباً ساٹھ اہم مسائل و معاملات کے متعلق قرآن کی روشنی میں بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان مسائل و معالات میں قرآن کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ کتاب آپ کو دوسرے تمام سہاروں سے بے نیاز کردیگی۔ اسے فقہ کی کتاب نہ کہئے۔ اس سے قرآن کی بصیرت افروز راہ نمائی حاصل ہوگی۔

ضخامت چار سو آٹھ (۴۰۸) صفحات۔ قیمت مجلد چار روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ناظم ادارہ طلوع اسلام
کوی روڈ (صدر)۔ کراچی

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

کراچی

بدل اشتراک	مرتّب	قیمت فی پرچہ
سالانہ چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی) غیر ممالک سے ۲۱ شلنگ	سعید احمد	دس آنے (پاکستانی) بارہ آنے (ہندوستانی)

نمبر ۱۰	اکتوبر ۱۹۵۳ء	جلد ۶

فہرستِ مضامین

قرآن کی آواز	۴
لمعات	۵ — ۱۰
سلیم کے نام (محترم پرویز صاحب)	۱۱ - ۲۲
مسلمانوں میں ملائیت کی ابتداء	۲۳ - ۳۶
نقد و نظر	۳۷ - ۴۲
ایک عزیز کے نام خط	
باب المراسلات	۴۳ - ۵۲
۱۔ طلوع اسلام اور جماعت اسلامی	
۲۔ خدا کا قانون۔	
رفتارِ عالم	۵۳ - ۶۰
انسان اور سیارہ (نظم) (محترم اسد ملتانی)	۶۱
نزول عیسیٰ بن مریمؑ کی حدیثوں کی تنقید (علامہ تمنا عمادی)	۶۲ - ۶۹
نہایت ضروری اعلان	۷۰
حلقۂ معاونین طلوع اسلام	۷۱

قرآن کی آواز

اگرچہ ہمارا یہ دور، ہر قسم کی پریشانیوں اور تکلیفوں کا دور ہے لیکن اس کے باوجود یہ دور اس اعتبار سے بڑا ہی برکت وسعادت کا دور ہے کہ اس میں تیرہ سو سال کے بعد پھر قرآن کی آواز بلند ہوئی ہے اور پھر دنیا کو وہ روشنی نصیب ہو رہی ہے جو اسے زندگی کی سیدھی اور ہموار راہ کی طرف لے جائیگی۔ طلوع اسلام اپنے بخت کی اس رسائی پر جسقدر بھی فخر کرے کم ہے کہ قرآنی آواز کے بلند کرنے کی یہ سعادت اس کے حصے میں آئی ہے۔

جو کچھ طلوع اسلام اسوقت تک کر سکا ہے، اس کے علاوہ اس کے پیش نظر حسب ذیل پروگرام ہے۔

(۱) قرآن کا جدید لغت، جس سے آسانی سے سمجھ میں آجائیگا کہ قرآنی الفاظ کا قرآنی مفہوم کیا ہے؟

(۲) قرآن کا جدید ترجمہ (یا مفہوم) جس سے دنیا علیٰ وجہ البصیرت دیکھ لے گی کہ یہ کتاب فی الواقعہ "خدا کی کتاب" ہے اور نوع انسانی کیلئے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات۔

(۳) قرآنی نظام ربوبیت جس سے معلوم ہو جائیگا کہ قرآن کا پیغام کیا ہے اور وہ انسانوں میں کس قسم کا معاشرہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ (یہ کتاب مکمل ہو چکی ہے)۔

(۴) سلسلۂ معارف القرآن کی تکمیل جس میں زندگی کے ہر شعبے کے متعلق، قرآن کی تعلیم بیک وقت سامنے آجائے گی۔ اس سلسلہ کی چار کتابیں شائع ہو چکی ہیں (لیکن ان میں سے پہلی تین کتابیں اسوقت نایاب ہیں)۔ ان کے علاوہ، پانچویں جلد کا مسودہ بھی تیار ہے۔ طلوع اسلام کا ارادہ یہ ہے کہ ان کتابوں کو انگریزی اور عربی زبان میں بھی شائع کیا جائے۔

مفکر قرآن جناب پرویز نے اس مقصد عظیم کی تکمیل کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی ہے۔ لیکن اس سلسلہ کی نشر و اشاعت تو روپے کے بغیر ناممکن ہے۔ اس کیلئے طلوع اسلام نے ابھی تک بطور عطیہ کچھ نہیں مانگا۔ البتہ ایک کاروباری قسم کی معاونت کی اسکیم کا اجرا کیا ہے۔ اسکیم یہ ہے کہ آپ ایک سو روپیہ (یکمشت یا چار ماہانہ اقساط میں) ادا کر دیں تو ادارہ آپ کو رسالہ طلوع اسلام اور ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتابیں بھیجتا چلا جائے گا تاوقتیکہ آپ کو پورے سو روپے کا لٹریچر مل جائے۔ اگر ہمیں اس قسم کے ایک ہزار معاونین مل جائیں تو ہمارا اندازہ ہے کہ اس سلسلہ کی تکمیل ہو جائے گی۔

اگر آپ سمجھتے ہیں کہ طلوع اسلام کا یہ پروگرام فی الواقعہ مفید ہے تو حلقۂ معاونین میں خود بھی شامل ہو جائیے اور اس کی وسعت میں کوشش بھی کیجئے۔ اگر آپ نے اسے مفید سمجھنے کے باوجود اس سے بے اعتنائی برتی تو یہ کام رک جائے گا اور اس کی ذمہ داری آپ پر بھی عائد ہوگی۔ اس کے بعد معلوم نہیں پھر کب اس قسم کے حالات پیدا ہوں!

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ کومی روڈ۔ کراچی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

یہ تو معلوم نہیں کہ

اعجاز تھا کسی کا یا گردشِ زمانہ

کہ ہمیں ہندوستان کے مشرق اور مغرب کی یہ بابرکت زمین بیٹھے بٹھائے مل گئی۔ لیکن گذشتہ چھ برس میں ہم نے جو کچھ کیا ہے اس سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آگئی ہے کہ جہانبانی و جہاں رانی کے لئے جس صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے اس سے ہم محروم ہیں۔ نظم و نسقِ مملکت کے مختلف گوشوں میں حالات جس قدر افسوسناک اور جگر خراش ہو چکے ہیں (اور ہوتے جارہے ہیں) اس کا تذکرہ ہر زبان پر ہے۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ اندوہناک اور عبرت انگیز یہ حقیقت ہے کہ ہم ابھی تک اپنی مملکت کا آئین بھی مرتب نہیں کر سکے۔ ۱۹۳۵ء کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ جو ہمارے دورِ غلامی کی یادگار رہے، اس وقت تک آزاد مملکت پاکستان کا آئین ہے۔ کسی ملک کی آزادی پر اس سے بڑھ کر اور دھبہ کیا ہو سکتا ہے کہ اس میں عہدِ غلامی کا آئین رائج ہو اور یہ صورت حالات ایک دو دن نہیں، برسہا برس تک مسلسل اور متواتر چلی جارہی ہو۔ ملک کی حکومتیں بدلتی جائیں، زمانے کے حالات تبدیل ہوتے چلے جائیں لیکن ہمارے عہد غلامی کے آئین میں کوئی تبدیلی نہ ہو سکے۔ موت اور حیات میں فرق یہ ہوتا ہے کہ مردہ جس حال میں ہوتا ہے اسی میں پڑا رہتا ہے اور زندہ قوموں کی حالت یہ ہوتی ہے

کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں

ہماری آئین سازی کی تاخیر میں کئی ایک عناصر کارفرما ہوئے ہیں۔ ان اسباب کی شکلیں اور نوعیتیں مختلف ہیں، لیکن اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو ان سب کے پیچھے ایک ہی بنیادی جذبہ کارفرما نظر آئے گا یعنی ہوسِ اقتدار کا جذبہ۔ ملک کی برسرِ اقتدار پارٹی کو شروع سے یہ خیال ستاتا رہا کہ اگر نیا کانسٹی ٹیوشن بن گیا تو اس کے مطابق نئے انتخابات ہوں گے اور نئے انتخابات میں ہو سکتا ہے کہ ہم برسرِ اقتدار نہ رہیں۔ لہٰذا عافیت اسی میں ہے کہ آئین سازی میں جسقدر ممکن ہو دیر کی جائے۔ دوسری طرف "ارباب مذہب" کی جماعت تھی جس نے بہت عرصے پہلے اپنے عزائم کا اعلان ان الفاظ میں کر دیا تھا کہ

یہ پارٹی اسلام کے اصولوں پر ایک نئے اجتماعی نظام اور ایک نئی تہذیب کی تعمیر کا پروگرام

لیکر اٹھے اور عامۂ خلائق کے سامنے اپنے پروگرام کو پیش کر کے زیادہ سے زیادہ سیاسی طاقت حاصل کرلے اور بالآخر حکومت کی مشین پر قابض ہوجائے۔ (ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۳۷ء)

لہٰذا ان کی کوشش یہ تھی کہ ملک کا آئین ایسا بنے جس میں اقتدار کی کنجیاں ان کے ہاتھ میں رہیں۔ چنانچہ یہ اپنی کوشش میں اس حد تک کامیاب بھی ہوگئے کہ بنیادی کمیٹی کی دوسری رپورٹ میں یہ تجویز شامل کردی گئی کہ ملک کا آئین شریعت اسلامی کے مطابق ہوگا اور یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کونسی بات شریعت کے مطابق ہے اور کونسی اس کے خلاف علماء کے بورڈ کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ یعنی ملک کی برسر اقتدار پارٹی تھی یا ان کے مدمقابل شریعت کے نام لیواؤں کی جماعت، دونوں کے سامنے مقصد ایک ہی تھا اور وہ یہ کہ ملک کا اقتدار کس طرح ان کے ہاتھ میں رہ سکتا ہے۔ اس کشمکش میں چھ برس گذر گئے اور اب صورت حالات افسوسناک سے مضحکہ انگیز بن چکی ہے۔ چنانچہ ایک طرف سے یہ آواز اٹھتی ہے کہ مکمل دستور سازی کے سوال کو ایک طرف رکھ کر ایک عبوری دستور مرتب کرلیا جائے (گویا اس وقت ہمارے ہاں کوئی عبوری دستور نہیں ہے؟) اس کے جواب میں اعلان ہوتا ہے کہ ملک کا مکمل دستور چھ مہینے میں بنایا جاسکتا ہے اور یہ اعلان ہوتا ہے مجلس دستور ساز کے صدر (تمیز الدین خاں صاحب) کی طرف سے جو گذشتہ چھ برس سے اسی مجلس کے صدر چلے آرہے ہیں جس مجلس کے متعلق اب یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ وہ چھ مہینے میں مکمل دستور مرتب کرسکتی ہے۔ بنگال کی طرف سے یہ مطالبہ ہو رہا ہے کہ عبوری دستور کے خیال کو چھوڑ کر بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی دوسری رپورٹ ہی کو مستقل آئین کی بنیاد قرار دیا جائے (اسلئے کہ اس رپورٹ کی سفارشات بنگال کے حق میں جاتی تھیں)۔ دوسری طرف، پنجاب سے آواز اٹھتی ہے کہ عبوری دستور کی تجویز پر غور کیا جائے (اسلئے کہ انھوں نے شروع ہی میں مذکورہ بالا رپورٹ کی متعلقہ سفارشات کی مخالفت کی تھی)۔ غرضیکہ حصولِ اقتدار اور طلبِ مفاد کی یہ سرکش موجیں اٹھ اٹھ کر ایک دوسرے سے ٹکرا رہی ہیں اور ان میں ملت بچاری کا سفینہ برگ گل ہچکولے کھا رہا ہے۔

جیسا کہ ہم ان صفحات میں متعدد بار لکھ چکے ہیں، ہمارے فیصلے جذبات کے تابع سرزد ہوتے ہیں اور ہم حقائق کا آمنا سامنا کرنے سے ہمیشہ جی چراتے ہیں۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ زمانہ کسی کے جذبات کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ اس کے فیصلے ہمیشہ حقائق کے مطابق ہوتے ہیں خواہ وہ کسی کو کتنے ہی ناپسند کیوں نہ ہوں۔ لہٰذا جب تک ہم جذبات سے الگ ہٹ کر حقائق کا سامنا کرنا نہیں سیکھیں گے، ہمارا کوئی فیصلہ بھی زمانے کے تقاضوں کا ساتھ

نہیں دے سکے گا۔ ہمارے ہاں مذہب کی دنیا میں جذبات کی نزاکت ضرب المثل حد تک شدید چلی آرہی تھی (اور وہی حالت آج بھی ہے) جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ خالص حقائق کی بنیادوں پر کسی دینی معاملہ کا فیصلہ ہی نہیں کر سکتے۔ لیکن اب یہ نزاکتِ جذبات، سیاست کی دنیا میں بھی وہی شدت اختیار کئے جا رہی ہے۔ مثلاً اگر کوئی بنگالی ایسی بات کہدے جس سے بنگال والوں کو شبہ گذرے کہ وہ غیر بنگالیوں کے حق میں جاتی ہے تو وہ اسے قوم کا غدار قرار دیدیں گے۔ اور اگر کوئی غیر بنگالی ایسی بات کہدے تو اس کے متعلق شور مچا دیا جائے گا کہ وہ قوم میں تفرقہ پیدا کر کے پاکستان سے دشمنی کا ثبوت دے رہا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ خالص حقائق کی بنیادوں پر کسی مسئلہ پر گفتگو ہی نہیں کی جا سکتی۔ لیکن (جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں) جب تک حقائق کو سامنے رکھ کر غور و فکر نہیں کیا جائے گا ہم کسی مسئلہ کے صحیح حل تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ اس باب میں وہ کون سے حقائق ہیں جنھیں نظر انداز کرنے سے ملک کی حالت اس قدر ناگفتہ بہ ہو رہی ہے۔ قبل اس کے کہ ہم ان حقائق کو بیان کریں اس حقیقت کا دہرا دینا نہایت ضروری ہے کہ جس طرح دین کے معاملہ میں طلوع اسلام کا تعلق کسی فرقہ سے نہیں اور اس کی ہر بات صرف **مسلمان** کی حیثیت سے ہوتی ہے اور وہ ہر مسئلہ پر قرآن کی روشنی میں غور کرتا ہے۔ اسی طرح امور مملکت میں طلوع اسلام کا تعلق نہ کسی پارٹی سے ہے اور نہ کسی صوبہ سے۔ اس کے نزدیک پارٹی بازی اور صوبائی تقسیم بھی اسی قسم کا "سیاسی شرک" ہے جس قسم کا "دینی شرک" مذہبی فرقہ بندی ہے۔ لہذا طلوعِ اسلام کی طرف سے جو کچھ پیش کیا جاتا ہے (اور پیش کیا جائے گا) وہ ایک پاکستانی کی حیثیت سے پیش ہوتا ہے (اور ہوتا رہے گا) بنا بریں اس کے پیش کردہ حقائق کو بھی اسی نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہیئے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جس طرح تمام دنیا کے مسلمان (اس دعوے کے باوجود کہ اسلام میں قومیت کا مدار کلمۂ توحید پر ہے) عملاً ایک قوم نہیں بلکہ ہر ملک کے مسلمان اپنے آپ کو ایک الگ قوم سمجھتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے (خواہ ہمیں یہ حقیقت کتنی ہی تلخ کیوں نہ معلوم ہو اور ہم اس سے کتنی ہی آنکھیں بند کیوں نہ کریں) کہ پاکستان کے مسلمان (باوجود اس دعوے کے کہ وہ ایک قوم کے فرد ہیں) عملاً ایک قوم نہیں بن سکے۔ یہاں ہر صوبے کے باشندے اپنے آپ کو ایک الگ قوم سمجھتے ہیں۔ اس میں پہلی تقسیم بدقسمتی سے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی ہے اور پھر مغربی پاکستان میں مختلف صوبوں کی تفریق۔ یعنی مشرقی پاکستان کے باشندے اپنے آپ کو مغربی پاکستان والوں سے ایک الگ قوم سمجھتے ہیں اور مغربی پاکستان میں ایک صوبے کے باشندے اپنے آپ کو

دوسرے صوبوں کے باشندوں سے الگ تصور کرتے ہیں۔ تحریک پاکستان کے دوران میں چونکہ سوال صرف مطالبہ پیش کرنے کا تھا اس لئے وہ مطالبہ تو متحدہ طور پر پیش کر دیا گیا لیکن تشکیل پاکستان کے بعد جب مطالبہ سے آگے بڑھ کر تقسیم مفاد کا وقت آیا تو ہمارا خطہ وارانہ تفرق کا احساس ابھر کر سطح کے اوپر آگیا۔ اور یہ حقیقت الم نشرح ہوگئی کہ اس متحدہ مطالبہ کے باوجود مختلف خطوں کے مسلمان درحقیقت ایک ملت کے قالب میں نہیں ڈھلے تھے۔ یہ اتحاد (یعنی متحدہ مطالبہ پیش کرنے کے زمانے کا اتحاد) مثال کے طور پر ایسا ہی تھا جیسا تحریک سوراج کے زمانے میں ہندؤں اور مسلمانوں کا اتحاد تھا۔ چونکہ اس وقت سوال صرف آزادی کے مطالبہ کا پیش کرنا تھا اس لئے جذبات کی رو میں بہہ کر سب نے ایک متحدہ قومیت کی حیثیت سے یہ مطالبہ پیش کر دیا لیکن جب اصلاحات کے بعد مفاد کی تقسیم کا وقت آیا تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آگئی کہ یہ دونوں ایک قوم کے افراد نہیں تھے۔ تحریک پاکستان کے دوران میں حالات اتنی تیز رفتاری سے بدل رہے تھے کہ اس کی فرصت ہی نہ تھی کہ مختلف صوبوں میں بسنے والے مسلمانوں میں جو بُعد اور افتراق، انگریز کی حکمت عملی نے پیدا کر رکھا تھا اُسے مٹا کر انہیں دل کی گہرائیوں سے خالص کلمۂ توحید کی بنیادوں پر ایک قوم کے قالب میں ڈھال دیا جاتا۔ تشکیل پاکستان کے بعد سب سے پہلے یہی کام کرنے کا تھا، لیکن یہاں پہنچ کر بدبختی سے قوم، مالِ غنیمت کی تقسیم میں اس درجہ منہمک ہوئی کہ اسے کسی تعمیری کام کی فرصت ہی نہ ملسکی۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا مملکتی مفاد کی تقسیم کا جذبہ بھی گہرا ہوتا گیا اور اس کے ساتھ ہی مختلف خطوں کی درمیانی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ آج حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کو تو چھوڑیئے اگلے دنوں سندھ کی اسمبلی میں یہ سوال اٹھایا گیا کہ سندھ کے رہنے والے ایک الگ قوم کے افراد ہیں۔ یہ سوال حزب مخالف کی طرف سے اٹھا تھا لیکن مسلم لیگی حکومت کے نمائندوں نے اس میں جو ترمیم کی وہ صرف اتنی تھی کہ سندھی مسلمان ایک الگ قوم تو نہیں لیکن اپنا جداگانہ تشخص (SEPARATE ENTITY) ضرور رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ فرق صرف الفاظ کا فرق ہے۔ اس کی تہ میں شعوری یا غیر شعوری طور پر جذبہ وہی کارفرما ہے کہ ایک صوبے میں بسنے والے پاکستانی مسلمان، دوسرے صوبے والوں سے الگ حیثیت رکھتے ہیں۔

آپ جذبات سے الگ ہٹ کر اپنے دل سے پوچھئے کہ جو کچھ ہم نے اوپر لکھا ہے وہ حقیقت ہے یا نہیں۔ آپ اپنے دل سے پوچھئے کہ کیا آج بنگالی اور غیر بنگالی۔ سندھی اور پنجابی۔ سرحدی اور بلوچستانی فی الواقعہ ایک ایسی ملی حیثیت اختیار کر چکے ہیں جیسے پانی کے قطرے دریا میں ملکر قطرے باقی نہیں رہتے دریا بن جاتے ہیں، یا ان میں سے ہر ایک اپنے آپ کو دوسرے خطے کے مسلمانوں سے الگ تصور کرتا ہے؟ اگر آپ کا دل اس کی گواہی دیتا ہے کہ پاکستان میں مختلف صوبوں کے مسلمان ایک دوسرے کے اندر اس طرح جذب نہیں ہو سکے کہ وہ باہمی ادغام سے ایک ملت بن چکے ہوں، تو پھر سوچئے کہ اس حقیقت سے آنکھیں بند کر کے پاکستان کے مسائل کا حل سوچنا کوئی مفید نتیجہ مرتب کر سکتا ہے؟ یہ ہے سب سے بڑی وجہ اس امر کی کہ ہم اسوقت تک

آئین سازی کے مسئلہ میں بھی ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکے۔

طلوع اسلام نے اس حقیقت کا احساس کرنے کے بعد (اپنے پیش کردہ مسودۂ آئین میں) یہ تجویز کیا تھا کہ پاکستان میں فیڈرل گورنمنٹ قائم کرنے کے بجائے وحدانی حکومت قائم کرنی چاہیئے۔ فیڈرل حکومت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مختلف صوبے اپنی اپنی جگہ مستقل حیثیت رکھتے ہوئے خود مختار وحدتیں تسلیم کئے جائیں۔ ان کی اپنی اپنی مجالس مقننہ ہوں اور اپنی اپنی وزارتیں اور حکومتیں۔ مرکز میں صرف وہ امور رکھے جائیں جن کا تعلق تمام صوبوں سے مشترکہ طور پر ہو۔ اس کے برعکس وحدانی حکومت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پورے ملک کو ایک وحدت تصور کرکے صرف ایک مرکزی حکومت قائم کی جائے اور صوبوں کی حدود بندی کو مٹا دیا جائے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر اس تجویز پر شروع ہی میں عمل کر لیا جاتا تو آج مختلف خطوں کے درمیان بُعد و افتراق کی یہ صورت کبھی پیدا نہ ہوتی۔ لیکن ہمارے خیال میں اب صورت حالات ایسی پیدا ہو چکی ہے کہ وحدانی انداز کی حکومت بھی شاید کامیاب نہ ہو سکے۔ اسلئے اب ہماری تجویز یہ ہے کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کو دو خود مختار وحدتیں تسلیم کرکے ان میں کانفیڈریسی پیدا کر دی جائے جس میں تراضیٔ مابین سے مشترکہ مسائل اکٹھے رکھ لئے جائیں۔ اس کے ساتھ ہی مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کو مٹا کر پورے ملک میں ایک حکومت قائم کی جائے۔

اس تجویز کے خلاف جذبات پرست طبقہ یہ کہہ کر شور مچا دیگا کہ دیکھئے ملت کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ملت کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرنا بہت بڑا جرم ہے۔ آپ خیال کیجئے کہ جس طلوع اسلام کے سامنے نصب العین یہ ہو کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو ملتِ واحدہ بنا کر ان میں ایک حکومت قائم کی جائے۔ نہیں! اس سے بھی ایک قدم اور آگے جس کا منتہائے نگاہ یہ ہو کہ تمام نوع انسانی کے لئے قرآن کی روشنی میں واحدہ نظام قائم کیا جائے۔ وہ طلوع اسلام خود اپنی قریب ترین ملت کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کی سفارش کس طرح کر سکتا ہے؟ لیکن جب واقعہ یہ ہو کہ وہ ملت ایک ملت بنی ہی نہیں بلکہ کئی ملتوں میں منقسم ہے تو پھر طلوع اسلام کی مذکورہ بالا تجویز ایک ملت کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرنا نہیں بلکہ ایک حقیقت کا اعتراف ہے اور اس اعتراف حقیقت کے بعد ایسا عملی حل جس سے ان دونوں ٹکڑوں کی درمیانی خلیج اس حد تک وسیع ہونے سے بچ جائے گی جس حد تک وسیع ہونے کا بحالات موجودہ خطرہ ہے۔ ہم مسلسل چھ برس سے پکارتے چلے آرہے ہیں کہ خدا کے لئے کوئی ایسی صورت پیدا کیجئے جس سے پاکستان میں صوبائی امتیاز کا احساس ختم ہو جائے۔ لیکن جب یہ صورت پیدا نہیں کی گئی (یا نہیں کی جا سکتی) تو اس کے بعد اس پیچیدہ مسئلہ کا حل اس کے سوا اور کوئی نظر نہیں آتا کہ حقائق کا اعتراف کرکے ایک ایسی صورت پیدا کر لی جائے جس سے مختلف خطوں کے پاکستانیوں میں خوشگواری تعلقات تو قائم رہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ جو صورت ہم مغربی پاکستان کیلئے تجویز کر رہے ہیں (یعنی تمام صوبوں کو مٹا کر (ایک حکومت کا قیام) اس تجویز میں بنگال کو بھی کیوں نہ شامل کر لیا جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پورے پاکستان میں وحدانی انداز کی حکومت قائم ہو۔ اگر یہ ہو جائے تو ہم سے زیادہ خوش اور کون ہوگا؟ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، طلوع اسلام نے اپنے اس مسودہ آئین میں جو

۱۹۵۱ء میں مجلس آئین ساز کو بھیجا تھا وحدانی طریق حکومت ہی کی تجویز پیش کی تھی۔ وحدانی طریقِ حکومت کی صورت میں ہماری یہ بھی تجویز ہے کہ نشستوں کی تعداد ووٹروں کی تعداد کے فیصد (PERCENTAGE) کے مطابق رکھی جائے۔ مثلاً دس ہزار ووٹروں پر ایک نشست ہو۔ لیکن اگر یہ صورت پیدا نہ ہو (اور بہ حالات موجودہ اس کی کوئی شکل نظر نہیں آتی) تو بر سبیل تنزل، کانفیڈریشن انداز کی حکومت قائم کر لی جائے تاکہ موجودہ رسہ کشی ختم ہو سکے۔ خدا کرے کہ ملک کا سنجیدہ طبقہ ہماری اس تجویز پر خالی الذہن ہو کر غور کر سکے۔

باقی رہا "نظام شریعت" کا مسئلہ۔ سو وہ مسئلہ فی الواقعہ ایسا مشکل نہیں جیسا اسے بنا دیا گیا ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ مسلمانوں کی مملکت کا نظام شریعت ہی پر مبنی ہونا چاہئے لیکن شریعت کا وہ مفہوم جو "ارباب مذہب" کی طرف سے پیش کیا جا رہا ہے غلط ہی نہیں بلکہ فریب انگیز بھی ہے۔ اسلام میں نظام شریعت سے مفہوم یہ ہے کہ قرآن کے ناقابلِ تبدل اصولوں کی روشنی میں ہر دور کے مسلمان، اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، اپنا نظام آپ وضع کریں۔ لہذا نظامِ شریعت کی ترتیب کے لئے قرآن کے اصولوں کا اور اپنے دور کے تقاضوں کا علم ہونا چاہئے۔ قرآن کوئی ایسی مشکل کتاب نہیں جو سمجھ میں ہی نہ آسکے: "ارباب مذہب" نے اسے دانستہ ہوّا بنا رکھا ہے اور یہ مشہور کر رکھا ہے کہ اسے سمجھنے کے لئے اٹھارہ علوم کی ضرورت پڑتی ہے، جن میں سے ہر ایک علم کی تحصیل کے لئے عمرِ نوح درکار ہے۔ لہذا آپ کو شریعت کا منشا معلوم کرنے کیلئے لامحالہ ان لوگوں کی طرف رجوع کرنا ہوگا جو ان علوم سے واقف ہیں۔ یہ ہے نظامِ شریعت کا وہ ہوّا جس سے ڈرتے ہوئے ہم تدوینِ دستور میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ پائے۔ اگر شریعت کو الگ کر کے دستور بناتے ہیں تو شور مچا دیا جاتا ہے کہ یہ مملکت لادینی ہو رہی ہے اور اگر اسے نظامِ شریعت کے مطابق بنانا چاہتے ہیں تو مملکت کی مہار اس ملا کے ہاتھ میں دیدینی پڑتی ہے جس نے مسلمانوں کی یہ حالت کر رکھی ہے کہ وہ دنیا میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے، نظامِ شریعت کا مسئلہ کچھ ایسا مشکل نہیں ہے جس سے یوں ڈرا جائے۔

یہ ہیں وہ حقائق جن کا اگر ایک مرتبہ اعتراف کر لیا جائے تو پھر ہماری کشتی آسانی سے موجودہ گرداب سے نکل سکتی ہے۔

بزمِ طلوعِ اسلام سیالکوٹ کا شکریہ

حلقۂ معاونین کی توسیع میں سب سے زیادہ کوشش بزمِ طلوع اسلام مردان کی طرف سے ہوئی ہے اور اس کے بعد دوسرا نمبر بزمِ سیالکوٹ کا ہے جن کیلئے ادارہ ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہے۔

سلیم کے نام

جنسی تعلقات کا تمدن پر اثر

سلیم میاں! تم نے بالآخر اس موضوع پر بھی بات چھیڑ دی جس سے تم اسوقت تک اتنی جھجک محسوس کر رہے تھے۔ یہ بہت اچھا ہوا کہ (تمہارے الفاظ میں) میرے احترام کے جذبہ پر اس موضوع کی اہمیت غالب آگئی۔ مجھے اس سے خوشی ہوئی کہ تم نے بات کرتے وقت اس روایتی حجاب کو آڑے نہیں آنے دیا جو اس باب میں اکثر نوجوانوں کے گلوگیر ہو جاتا ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے ایسے اہم عنوان پر صحیح راہ نمائی سے محروم رہ جاتے ہیں اور یہی حجاب ان کی تباہی کا موجب بن جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں جنسی تعلقات کے موضوع کو اسقدر شجرِ ممنوعہ سمجھا جاتا ہے کہ "شریفوں کی مجلس" میں اس کا نام تک لینا بھی بے حیائی تصور کیا جاتا ہے۔ یہ غیر شعوری طور پر نتیجہ ہے اس خانقاہی ضابطۂ اخلاق (MYSTICAL ETHICS) کا جو عیسائیت کی رہبانیت سے تصوف کا لبادہ اوڑھ کر ہمارے ہاں آپہنچا اور جس نے ہمارے تمام تصورات کو متاثر کر دیا۔ چونکہ رہبانیت میں جنسی تعلقات کو سخت معیوب اور وجۂ ذلت انسانیت سمجھا جاتا ہے اس لئے ہمارے ہاں بھی جنسیات کو نہایت شرمناک تصور کیا جاتا ہے اور کسی کے سامنے اس کا ذکر آجانے سے پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ جب ہمارے معاشرے میں جنسیات کے ذکر تک کو اسقدر شرمناک سمجھا جاتا ہو تو ظاہر ہے کہ اس موضوع پر ہمارے ہاں لٹریچر کس طرح مل سکتا ہے! چنانچہ جہاں تک میری معلومات میری یاوری کرتی ہیں ہمارے ہاں اس موضوع پر کوئی ایک کتاب بھی ایسی نہیں جسے سنجیدگی سے کسی نوجوان کے ہاتھ میں دیا جاسکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے نوجوان (لڑکے اور لڑکیاں دونوں) چوری چھپے اس سطحی (CHEAP) جنسی لٹریچر کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں جو آوارگانِ مغرب کی بےلگام ذہنیت کا پیدا کردہ ہوتا ہے اور جس سے طرح طرح کے ذہنی، اور اعصابی اور جسمانی مفسدات پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں (حالانکہ یورپ میں اس موضوع پر سائنٹفک، سنجیدہ اور بلند پایہ لٹریچر کی بھی کمی نہیں لیکن چونکہ ہمارے نوجوان اس موضوع پر کسی سے بات کرنے سے شرماتے ہیں اسلئے ان کی صحیح رہنمائی ہو نہیں سکتی اور ان کی رسائی صرف چیپ لٹریچر تک ہوتی ہے) یہ غالباً اسی لٹریچر یا ان خیالات کا نتیجہ ہے جو اس لٹریچر سے فضا میں پھیل چکے ہیں، جو تم نے بھی یہ سمجھ لیا ہے کہ مرد اور عورت کا جنسی تعلق ایک طبعی تقاضے کی تسکین، یا افزائشِ نسل کیلئے حیاتیاتی عمل (BIOLOGICAL ACTION) ہے اور بس۔ اور اس کا اثر طبعی جسم (PHYSICAL BODY) سے آگے نہیں ہوتا۔ اس مفروضہ پر تم نے جنسیاتی نظام کی وہ ساری عمارت کھڑی کر لی ہے جس کی رو سے تم نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ معاشرہ کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ ایک نوجوان مرد اور بالغ عورت کے آزادانہ

جنسی تعلقات پر پابندیاں عائد کرے اور اس طرح انسان کے فطری وظیفہ کو غیر فطری حدود و قیود (RESTRICTIONS) سے محفوظ کردے؟ تمہارا کہنا یہ ہے کہ جنسی تعلق کی وہی شکل قابلِ مواخذہ سمجھنی چاہئیے جو عورت کی رضامندی کے بغیر عمل میں لایا جائے۔ تراضئ باہمی سے باہمی خلا ملا کی عام آزادی ہونی چاہئیے۔ تم نے ان خیالات کے اظہار سے اس طبقہ کی ٹھیک ٹھیک ترجمانی کی ہے جو جنسی نوضویت (SEXUAL ANARCHY) کا علمبردار ہے اور جس نے یہ سب کچھ اس سطحی لٹریچر سے سیکھا ہے جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے۔

جنسیات کا موضوع بڑا اہم ہے اور بڑی تفصیلی گفتگو کا متقاضی۔ اسلئے میرے لئے یہ تو مشکل ہوگا (بلکہ ناممکن) کہ میں ایک خط (یا چند خطوط) میں اس کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کرسکوں۔ اس کیلئے تو تمہیں میری مستقل تصنیف کا انتظار کرنا ہوگا۔ اس خط میں (البتہ) میں کوشش کروں گا کہ اس موضوع کے اس اہم گوشے کے متعلق کچھ سمجھا سکوں کہ ایک مرد اور عورت کے جنسی تعلق کا اثر محض حیاتیاتی اور طبعی (BIOLOGICAL AND PHYSICAL) ہے یا اس کا دائرہ اس سے وسیع ہے۔ چونکہ تم نے کہا ہے کہ میں اس موضوع پر معاشرہ کے مسلّمات کو بطورِ دلیل یا سند پیش کرکے تمہارا "منہ بند کرنے" کی کوشش نہ کروں اس لئے میں اس خط میں انہی لوگوں کے خیالات کو پیش کروں گا جو تمہارے نزدیک یا اس طبقے کے نزدیک جس کی تم ترجمانی کر رہے ہو" دلیل اور سند" بننے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اگر تم یہ پابندی نہ بھی لگاتے تو بھی مجھے بیشتر مغربی محققین کی تحقیقات کی طرف ہی رجوع کرنا پڑتا اسلئے کہ جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں جنسیات کے موضوع پر ہمارے ہاں ابھی تک کوئی تحقیق نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس یورپ میں اس موضوع نے ایک مستقل سائنس کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے۔ اس کے لئے وہاں تحقیقاتی ادارے قائم ہیں۔ علمائے عمرانیات (SOCIOLOGIST) تہذیب کے مورخ علمائے جنسیات اور ماہرینِ علم تجزیۂ نفس (PSYCHO-ANALYSTS) وغیرہم نے اس موضوع پر کافی چھان بین کی ہے۔ اور جنسیات سے متعلق سنجیدہ قسم کا لٹریچر خاصی مقدار میں شائع ہو چکا ہے اور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ان کی تحقیقات کا بالعموم انداز یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے دور دراز علاقوں میں بسنے والے قدیم باشندوں (PRIMITIVE TRIBES) کے احوال و کوائف، بود و ماند، رسوم و معاشرت، اور اجتماعی اعمال و معتقدات کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس طرح حاصل کردہ مسالہ (DATA) سے نتائج مستنبط کرتے ہیں[1]۔ اس مقصد کے لئے انہیں جن صبر آزما و مشقت طلب مراحل سے گذرنا پڑتا ہے اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ان میں ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنی ساری عمر افریقہ کے صحراؤں، جنوبی امریکہ کے جنگلوں، قطبین کے برفانی میدانوں اور ہمالیہ کے پہاڑوں میں گذار دی۔ وہ وہاں کے وحشی قبائل میں جا کر رہے۔ انہی کی معاشرت اختیار کی۔ وہی کچھ کھایا جو وہ کھاتے تھے۔ وہی کچھ پہنا جو وہ پہنتے تھے۔ انہی کے

[1] واضح رہے کہ ان کا انداز اس طریق سے مختلف ہے جو آجکل (بالخصوص) امریکہ میں رائج ہے اور جس کی رو سے ایک خاص خطہ یا طبقہ کے لوگوں کو سوالنامہ دیدیا جاتا ہے اور ان کے جوابات سے اعداد و شمار (STATISTICS) جمع کرکے نتائج اخذ کرلئے جاتے ہیں اور ان نتائج کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ عالمگیر اور فطرتِ انسانی کے ترجمان ہیں۔ آجکل امریکہ میں (KINSLEY) کے قسم کے محقق اسی انداز سے جنسیات کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ یہ طریقِ کار کبھی عالمگیر (UNIVERSAL) نتائج بہم نہیں پہنچا سکتا۔

ساتھ، کبھی درختوں کے کھوکھلے تنوں میں، کبھی ان کی شاخوں کے اوپر، کبھی پہاڑوں کے غاروں میں اور کبھی درندوں کے بھٹوں میں زندگی بسر کی۔ بعض اوقات انہی میں شادیاں بھی کیں اور اس طرح انہی میں گھل مل کر ان کی معاشرت اور معتقدات کا دقت نظر سے مطالعہ کیا اور اس طرح ان کے متعلق براہ راست معلومات بہم پہنچائیں۔ کبھی یہ کچھ سلیم! تمہارے اور ہمارے اسلاف بھی کیا کرتے تھے۔ لیکن دنیا میں "پدرم سلطان بود" کا دعویٰ کبھی وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا۔ زندگی یہ پوچھتی ہے کہ "تم کیا ہو" نہ یہ کہ تمہارے اسلاف کیا تھے؟

بہر حال یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ یورپ کے محققین نے دنیا کے قبائل کی معاشرت اور معتقدات کے مطالعہ کے بعد جن موضوعات کے متعلق اصول متعین کئے ہیں، ان میں جنسیات کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کے مرتب کردہ نتائج ہمیں اس حقیقت تک پہنچاتے ہیں کہ مرد اور عورت کے جنسی تعلق کا معاملہ محض شہوانی جذبہ کی تسکین تک محدود نہیں ہوتا، اس کا اثر بڑا دوررس ہوتا ہے ان کی تحقیق یہ ہے کہ کسی قوم کے تمدن (CULTURE) کا گہرا تعلق اس سوال سے ہے کہ اس قوم نے جنسی تعلقات کو آزاد چھوڑ رکھا تھا یا اس پر پابندیاں لگا رکھی تھیں اور اگر پابندیاں لگا رکھی تھیں تو وہ کس نوعیت کی تھیں۔ انہی محققین میں کیمبرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر (J. D. UNWIN) کا نام خاص شہرت کا حامل ہے۔ ڈاکٹر اَنون نے دنیا کے مختلف حصوں میں بسنے والے اسّی غیر مہذب (قدیمی) قبائل کی زندگی کا مطالعہ اس نکتہ نگاہ سے کیا ہے کہ انسانی زندگی میں جنسیات اور کلچر کا کیا تعلق ہے؟ ان میں اگر ایک قبیلہ جنوبی امریکہ کا ہے تو دوسرا قطب شمالی کا۔ ایک آسٹریلیا کا ہے تو دوسرا صحرائے افریقہ کا۔ اس کے بعد اس محقق نے سولہ مہذب اقوام کی معاشرت کا مطالعہ کیا ہے۔ اور اپنے نتائج تحقیقات کو اپنی گرانبہا کتاب (SEX AND CULTURE) میں پیش کیا ہے جس کا پہلا فقرہ یہ ہے:۔

> دنیا کی مہذب اقوام ہوں یا غیر مہذب قبائل، سب کے ہاں جنسی مواقع اور قوم کی تمدنی حالت میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ اس مسئلہ پر تفصیلی تحقیق کی جائے۔ میری اس تحقیق کا ماحصل اور اس سے مستنبط کردہ نتائج اس کتاب میں پیش کئے گئے ہیں۔

اصل کتاب سے بھی پہلے دیباچہ میں لکھا ہے کہ

> اپنی تحقیقات کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ انسانوں کا کوئی گروہ ہو، اس کی تمدنی سطح کا انحصار دو چیزوں پر ہے۔ ایک ان لوگوں کی ساخت اور دوسرے وہ توانائی جو ان حدود و قیود کی بنا پر حاصل ہوتی ہے جو اس گروہ نے جنسی تعلقات پر عائد کر رکھی ہوں۔

اسی کلیہ کو اس نے اصل کتاب میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

> کوئی گروہ کیسے ہی جغرافیائی ماحول میں رہتا ہو۔ اس کی تمدنی سطح کا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ اس نے اپنے ماضی اور حال میں جنسی تعلقات کے لئے کس قسم کے ضوابط مرتب کر رکھے تھے۔ (ص ۳۴۰)

تم نے غور کیا سلیم! کہ یہ محقق اپنی تحقیقات کے بعد کس نتیجہ پر پہنچا ہے؟ وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ جنسی تعلقات محض ایک حیوانی جذبہ کی تسکین کا نام نہیں۔ بلکہ قوموں کی تہذیب و تمدن کا دارومدار اسی جذبہ کی تحدید و تادیب پر ہے۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر اَنون یہ بھی لکھتا ہے کہ اگر کسی قوم کی تاریخ میں آپ دیکھیں کہ کسی وقت اس کی تمدنی سطح بلند ہو گئی تھی یا نیچے گر گئی تھی تو تحقیق سے معلوم ہو گا کہ اس قوم اپنے

جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کی تھی جس کا نتیجہ اس کی تمدنی سطح کی بلندی یا پستی تھا۔ (ص۳۲)

آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ

جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کے اثرات تین پشتوں کے بعد (یعنی قریب سو سال میں) نمودار ہوتے ہیں۔ (ص۳۳)

اس لئے اگر کسی قوم میں تمدنی تبدیلی واقع ہو۔ یعنی اسے دنیا میں عروج حاصل ہو یا اس پر زوال آجائے تو اس عروج و زوال کے اسباب کے لئے دیکھنا یہ چاہئے کہ اس قوم نے سو سال پہلے اپنے ہاں جنسی تعلقات کے ضوابط میں کس قسم کی تبدیلیاں کی تھیں۔ جیسی وہ تبدیلیاں ہوں گی اسی قسم کے نتائج مرتب ہوں گے۔

سب سے پہلے تجرد کی زندگی (CELIBACY) کو لو جسے عیسائیت (اور اس سے متاثر شدہ مسلک خانقاہیت) روحانی ارتقاء کے لئے اولین شرط قرار دیتا ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر اَنْوِن کی تحقیق یہ ہے کہ

جبری تجرد کے اثرات انسانی تمدن پر ہلاکت انگیز ہوتے ہیں۔ (ص۸۲)

جبری تجرد سے مفہوم یہ ہے کہ یہ چیز انسانی عقائد یا معاشرتی ضوابط میں شامل کر دی جائے کہ تجرد کی زندگی وجہ شرف و تقدس ہے اور اس طرح لوگوں کو ذہنی طور پر مجبور کر دیا جائے کہ وہ تجرد کی زندگی بسر کریں۔ جیسے عیسائیوں کے ہاں (NUNS) اس قسم کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔

مسلک خانقاہیت میں اگر تجرد کی زندگی کو ارتقاء انسانیت کی بنیادی شرط قرار دیا جاتا تھا تو اس کے برعکس آج یہ کہا جاتا ہے کہ انسان کے شہوانی جذبات پر پابندیاں عائد کرنے اور اسے آزادانہ پورا نہ ہونے دینے کا اثر انسان کے اعصاب پر بہت برا پڑتا ہے اور اس سے خطرناک قسم کے اعصابی امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر اَنْوِن کی تحقیق یہ ہے کہ یہ خیال یکسر غلط ہے۔ وہ کہتا ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ (دیباچہ ص۱۱)

ڈاکٹر اَنْوِن نے قدیم غیر مہذب قبائل کی تمدنی سطح کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ وہ سب سے نچلے درجے کا نام (ZOISTIC) رکھتا ہے۔ اس سے اوپر (MANISTIC) کا درجہ ہے۔ اور سب سے اوپر (DEISTIC) کا درجہ۔ اس کے بعد وہ اسّی قبائل کی تمدنی سطح کے مطالعہ کے بعد جن نتائج پر پہنچا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) جن گروہ نے کنوارپن کے زمانے میں جنسی تعلقات کی کھلی آزادی دے رکھی تھی وہ تمدن کی پست ترین سطح پر تھے۔

(۲) جن قبائل میں زمانۂ قبل از نکاح میں جنسی تعلقات پر تھوڑی بہت پابندیاں عائد تھیں وہ تمدنی سطح کے درمیانی درجے پر تھے اور

(۳) تمدن کی بلند ترین سطح پر صرف وہ قبائل تھے کہ جو شادی کے وقت عفت و بکارت (CHASTITY) کا شدت کے تقاضا کرتے تھے اور زمانۂ قبل از نکاح میں جنسی تعلق کو معاشرتی جرم قرار دیتے تھے۔ (ص۳۵)

ڈاکٹر اَنْوِن کی تحقیق کے یہ نتائج اس کی کتاب کے مختلف اوراق پر پھیلے ہوئے ہیں۔

اس کے بعد ڈاکٹر انون، شادی کے بعد کے جنسی ضوابط سے بحث کرتا ہے۔ لیکن اس بحث کو چھیڑنے سے پہلے وہ اس حقیقت پر کچھ زور دیتا ہے کہ

شادی کے بعد کے ضوابط کبھی تعمیری نتائج پیدا نہیں کر سکتے جب تک شادی سے پہلی زندگی میں عفت و عصمت پر زور نہ دیا جائے۔ (ص ۳۴۳)

اس مقصد کے لئے وہ شادی کو چار بڑی بڑی قسموں میں تقسیم کرتا ہے۔ یعنی

(۱) عورت اپنی ساری زندگی میں ایک خاوند کی بیوی بن کر رہے اور مرد ساری زندگی میں ایک عورت کا خاوند رہے۔ ان کے رشتۂ نکاح کے منقطع ہونے کی کوئی شکل نہ ہو، بجز اس کے عورت، معاشرہ کی طرف سے عائد کردہ حد بندی کی خلاف ورزی کرے۔ اس کا نام اس کے نزدیک مطلق وحدتِ زوج (ABSOLUTE MONOGAMY) ہے۔

(۲) رشتۂ نکاح عمر بھر کے لئے نہ ہو بلکہ تراضیٔ باہمی سے منقطع ہو سکتا ہو۔ اسے وہ ترمیم شدہ وحدت زوج (MODIFIED MONOGAMY) کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔

(۳) عورت تو صرف ایک خاوند کی بیوی بن کر رہے لیکن مرد کو اجازت ہو کہ وہ ایک سے زیادہ عورتیں رکھ سکے۔ اس کا نام اس کے نزدیک مطلق تعدد ازدواج (ABSOLUTE POLYGAMY) ہے۔ اور

(۴) اگر مرد دوسری عورتوں سے جنسی تعلق قائم کرے (یعنی ایک سے زیادہ بیویاں کر لے) تو عورت بھی آزاد ہو کہ وہ اسے چھوڑ کر کسی اور کے ہاں چلی جائے۔ اسے وہ ترمیم شدہ تعدد ازدواج (MODIFIED POLYGAMY) کہتا ہے۔

ڈاکٹر انون کا کہنا ہے کہ آج تک کوئی قوم شق ۱ کی "مطلق وحدتِ زوج" کے مسلک کو زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رکھ سکی (ص ۳۴۴) اس لئے کہ یہ شکل اسی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے جب معاشرہ میں عورت کی کوئی حیثیت تسلیم نہ کی جائے اور اسے مجبور کیا جائے کہ وہ ہمیشہ اپنے خاوند کی مطیع و فرمانبردار لونڈی بن کر رہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کسی معاشرہ میں ایسی صورت دیر تک قائم نہیں رہ سکتی کیونکہ عورت کی طرف سے اس کا ردِ عمل ایسا شدید ہوتا ہے کہ وہ پھر معاشرہ کے تمام جنسی قیود کو توڑ کر "کامل آزادی" کا مطالبہ کر دیتی ہے اور اس کامل آزادی کے معنی ہوتے ہیں جنسی نوضویت جس کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ (ص ۳۴۵) لہٰذا ڈاکٹر انون کی تحقیق کے مطابق انسانی تاریخ اس وقت تک جن اقوام و قبائل کے حالات محفوظ رکھ سکی ہے ان میں سب سے بہتر تمدن کی حامل وہ قوم تھی جو شادی سے قبل جنسی اختلاط کی مطلقاً اجازت نہیں دیتی تھی اور شادی کے بعد شق ۲ کی ترمیم شدہ وحدتِ زوج کی پابند تھی۔ یعنی شادی کے بعد بھی جن کا عام اصول یہ تھا کہ جنسی تعلق صرف میاں بیوی میں رہے۔ یہ رشتۂ نکاح محکم و استوار ہو، لیکن ناقابلِ تنسیخ نہ ہو۔ بلکہ بعض حالات کے ماتحت منقطع ہو سکتا ہو۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جنسی تعلقات پر اس قسم کی قیود و حدود عائد کرنے کا اثر کیا ہوتا ہے؟ اس کے متعلق ڈاکٹر انون نے، مختلف ماہرینِ علوم کی شہادات سے اہم نتائج مستنبط کئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جنسی تعلقات کی تحدید سے ایک قسم کا ذہنی

اور عصبی تناؤ پیدا ہوتا ہے جس سے جذباتی توانائی میں ارتکاز (COMPRESSION) پیدا ہوجاتا ہے (ص۳۱۳) یہ مرتکز شدہ معاشرتی توانائی اپنی نمود کے لئے مختلف راستے تلاش کرتی ہے۔ اس نفسیاتی عمل کو ڈاکٹر فرائڈ کی اصطلاح میں کظامت[۱] (SUBLIMATION) کہا جاتا ہے چنانچہ ڈاکٹر انون لکھتا ہے کہ

نفسیاتی تحقیقات سے ہویدا ہے کہ جنسی تعلقات پر حدود و پابندیاں عائد کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم میں قوتِ فکر و عمل بہت بڑھ جاتی ہے۔ نیز محاسبۂ خویش کی صلاحیت بھی۔ (ص۳۱۷)

اس کے برعکس جو قوم اپنے مردوں اور عورتوں کو آزاد چھوڑ دے کہ وہ جنسی خواہشات کی تسکین جس طرح جی چاہے کرلیں۔ اس میں فکر و عمل کی قوتیں سلب ہوجاتی ہیں۔ چنانچہ

رومیوں نے ایسا ہی کیا۔ وہ حیوانوں کی طرح بلا حدود و قیود جنسی جذبات کی تسکین کرلیا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ ان کے پاس کسی اور کام کے لئے توانائی باقی ہی نہ رہی (ص۳۹۸)

ڈاکٹر انون کا کہنا یہ بھی ہے کہ اس معاشرتی توانائی (SOCIAL ENERGY) کی تخلیق میں مردوں سے کہیں زیادہ عورتوں کا حصہ ہے (ص۳۲۲) اس لئے

مردوں کی عصمت بھی اسی صورت میں معاشرتی توانائی پیدا کرسکتی ہے جب عورتیں باعصمت ہوں۔ اور ان کی عصمت، شادی سے قبل اور بعد، دونوں زمانوں میں محفوظ رہے (ص۳۲۳)

سلیم! ان تصریحات پر غور کرو اور پھر سوچو کہ کیا جنسی تعلق، محض ایک طبیعیاتی عمل ہے جسے حیوانوں[۲] کی طرح بلا حدود و قیود پورا کرلینے سے کچھ نہیں بگڑتا یا اس مسئلہ کا تعلق انسانیت کی بلند ترین زندگی اور اس کے تمدنی ارتقاء سے ہے؟ پھر اس پر بھی

---

[۱] قرآن میں "والکاظمین الغیظ" کا یہی مفہوم ہے۔ یعنی اپنی اس حرارت کو جو غصے کی شکل میں باہر نکلنا چاہتی ہے، کسی دوسری طرف منتقل کرکے اس سے تعمیری نتائج کا کام لے لینا۔ عربوں میں (اور بعض دوسرے مقامات پر بھی) یہ قاعدہ تھا کہ وہ مختلف کنوؤں کو اندر ہی اندر نالیاں کھود کر ملادیتے تھے۔ اس طرح جس کنوئیں میں پانی زیادہ ہوتا تھا اس کا پانی اس کنوئیں میں آجاتا تھا جس میں پانی کم رہ جاتا تھا۔ اس طریق کا نام کظامت تھا۔ اسی کو دورِ حاضر کی نفسیاتی اصطلاح میں (SUBLIMATION) کہا جاتا ہے۔ یعنی ایک طرف کی زائد توانائی کو دوسری طرف منتقل کردینا۔ قرآن نے "کاظمین الغیظ" کہہ کر اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لہٰذا اس کے معنی غصے کو دبانے والے نہیں بلکہ غصے کی حدت آفریں توانائی کو دوسری طرف منتقل کردینے والے ہیں۔

[۲] حیوان اخلاقی ضوابط سے تو نا آشنا ہوتے ہیں لیکن ان میں جنسی تعلقات پر طبعی کنٹرول، خود قانونِ فطرت نے عائد کر رکھا ہے۔ ایک سانڈ بیل ہر روز گایوں کے گلے میں پھرتا رہتا ہے لیکن کبھی جنسی اختلاط نہیں کرتا تاوقتیکہ اسے گائے کی طرف سے استقرارِ حمل کا طبعی تقاضا اسکی دعوت نہ دے۔ انسان پر طبعی کنٹرول فطرت کی طرف سے نہیں عائد کیا گیا (کیونکہ اسے عقل و ہوش سے نوازا گیا ہے) اور اگر یہ اخلاقی کنٹرول سے خود آزاد ہوجائے تو یہ حیوانات سے بھی بدتر حالت پر پہنچ جاتا ہے۔ (بل ھم اضل)۔

غور کرو کہ ان حقائق کو منکشف کرنے والا اور ان نتائج پر پہنچنے والا (ڈاکٹر انون) نہ کوئی مذہبی پیشوا ہے اور نہ ہی اخلاقی راہنما۔ وہ محض ایک سائنٹسٹ یا مفکر ہے جس نے خالصتاً نظری اور علمی حیثیت سے اس مسئلہ کی تحقیق کی ہے۔ اس کے بعد اس حقیقت پر غور کرو کہ قرآن نے جنسی عصمت پر جو اس قدر زور دیا ہے تو اس سے مفہوم کیا ہے؟ اس کے نزدیک زنا ظلم ہے (۱۲/۲۳)۔ یہ نہ صرف بے حیائی کی بات ہے بلکہ وہ راستہ ہے جس سے معاشرتی ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں (۴/۲۲)۔ یہ منجملہ فواحش ہے اور فواحش کے قریب تک جانا بھی (قرآن کی رو سے) حرام ہے (۶/۱۵۲)۔ یہ ان چند جرائم میں سے ایک جرم ہے جس کی سزا خود قرآن نے متعین کر دی ہے (۲۴/۲)۔ یہ تو اس کا سلبی پہلو ہے۔ ایجابی پہلو پر قرآن نے واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ کسی قوم کے مفلح (PROSPEROUS) ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے مرد و زن اپنی عصمت کی پوری پوری حفاظت کریں۔ (قد افلح المؤمنون . . . . الذین ھم لفروجھم حٰفظون (۲۳/۱-۵)) (نیز ۲۴/۳۰) ڈاکٹر انون نے سلیم! یہی کہا ہے نا، کہ جو قوم اپنی عصمت کی حفاظت نہیں کرتی اس کی معاشرتی توانائیاں ضائع ہو جاتی ہیں اور اس لئے وہ کلچر کے میدان میں دوسری قوموں سے پیچھے رہ جاتی ہے۔ ذرا سنو کہ قرآن نے اس حقیقتِ کبریٰ کو کن جامع الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زنا ایسا عمل ہے کہ من یفعل ذالک یلق اثاما (۲۵/۶۸)۔ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ "جو ایسا کرے گا وہ اثم میں مبتلا ہو جائے گا"۔ اثم کے معنی عام طور پر گناہ کئے جاتے ہیں۔ لیکن اثم کے لغوی معنی ہیں وہ اونٹنی جو تکان، اضمحلال، ماندگی، کمزوری کی وجہ سے اپنی قطار سے پیچھے رہ جائے۔ غور کرو سلیم! کہ قرآن نے "یلق اثاما" کہہ کر کتنی بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا ہے یعنی وہ قوم جو جنسی تعلقات کو آزاد چھوڑ دیگی، ضعف و اضمحلال کی وجہ سے اقوامِ عالم سے پیچھے رہ جائے گی۔ اس میں وہ معاشرتی توانائیاں باقی نہیں رہیں گی جو قوموں کو تمدنی بلندیاں عطا کرتی ہیں۔

قرآن کی رو سے جنسی اختلاط کی صرف ایک ہی صورت جائز ہے یعنی نکاح۔ لہٰذا قبل از نکاح جنسی اختلاط، اور نکاح کے بعد عورت کا کسی دوسرے مرد سے، یا مرد کا کسی دوسری عورت سے، جنسی اختلاط (خواہ وہ تراضی مابین ہی سے کیوں نہ ہو) زنا ہے۔ نکاح کے متعلق میں (طاہرہ کے نام خط میں) بصراحت بتا چکا ہوں کہ یہ "ہنگامی جنسی اختلاط کی رضامندی" نہیں ہوتی بلکہ یہ معاہدہ ہوتا ہے اس امر کا کہ ہم (میاں بیوی) ان تمام قیود و حدود اور حقوق و فرائض کے مطابق جو ہم پر قرآن نے عائد کی ہیں باہمی رفاقت کی زندگی بسر کریں گے۔ اسی سے ایک اور حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے۔ ڈاکٹر انون نے اپنے ہاں زنا کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ (اسے اس لفظ کے استعمال کی ضرورت بھی نہیں تھی اس لئے کہ وہ مذہبی یا اخلاقی بحث نہیں کر رہا بلکہ جنسی مسئلہ کے متعلق علمی اور نظری تحقیق کر رہا ہے۔ لہٰذا اس کا انداز سائنٹفک ہونا چاہئے تھا)۔ اس نے اپنے ہاں جنسی اختلاط کے مواقع (SEXUAL OPPORTUNITIES) کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ جس قوم میں جنسی اختلاط کے مواقع زیادہ ہوں گے وہ قوم تمدنی سطح میں بہت پست ہوگی اور جس میں یہ مواقع کم از کم حد تک رکھے جائیں گے، وہ تمدنی سطح کی بلندیوں تک پہنچ جائے گی۔ قرآن نے صرف زنا ہی کو حرام نہیں قرار دیا بلکہ جنسی اختلاط کے مواقع کو کم سے کم حد تک محدود کر دیا ہے۔ اس میں قبل از نکاح، جنسی اختلاط کے مواقع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نکاح کا معاہدہ، اس کے نزدیک عمر بھر کی رفاقت (LIFE-LONG COMPANIONSHIP).

کے ارادے کا اظہار ہے۔ لہٰذا اس میں وقتی جنسی اختلاط کے لئے باہمی رضامندی (جسے عام طور پر متعہ کہا جاتا ہے) کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ پھر اس نے نکاح کو میثاقاً غلیظاً (پختہ عہد) کہا ہے، بچوں کا کھیل نہیں کہا کہ جب جی چاہا کھیل کھیل لیا اور جب طبیعت اکتا گئی تو اس مٹی کے گھروندے کو پامال کر دیا اور دوسرے وقت پھر نیا گھر بنا لیا۔ علاوہ بریں اس نے وحدتِ زوج کو بطور اساسی اصول مقرر کیا ہے اور تعدد ازواج کو محض ایک ہنگامی تمدنی مشکل کے حل کے لئے بطور عارضی علاج جائز قرار دیا ہے (اس کی بھی محض اجازت ہے، حکم نہیں)۔ تم دیکھو گے کہ شادی کی یہ (قریب قریب) وہی شکل ہے جسے انون نے مطلق وحدتِ زوج (ABSOLUTE MONOGAMY) کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ میں نے "قریب قریب" اس لئے کہا ہے کہ ڈاکٹر انون کے نزدیک اس قسم کی شادی صرف اسی صورت میں منقطع ہو سکتی ہے جب عورت جنسی (اخلاقی) جرم کی مرتکب ہو جائے۔ لیکن قرآن نے عدم رفاقت اور فقدانِ ہم آہنگی کو بھی فسخ معاہدہ (طلاق) کی معتدل اور جائز وجہ قرار دیا ہے۔ بہر حال یہ ظاہر ہے کہ قرآن نے جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک محدود کر دیا ہے۔ وہ زمانہ قبل از نکاح میں جنسی اختلاط کے کسی ایک موقع کو بھی جائز قرار نہیں دیتا۔ اور نکاح کے بعد مواقع کے تنوع کی صرف ایک ہی صورت باقی رکھتا ہے کہ میاں بیوی میں عدم موافقت کی وجہ سے طلاق ہو جائے اور پھر یہ جوڑا کسی دوسری جگہ شادی کر لے۔ طلاق کے لئے بھی کن مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ اس کا ذکر سابقہ خطوط میں کیا جا چکا ہے)۔ قرآن کہتا ہے کہ صرف وہی قوم زندگی کی کامرانیوں سے بہرہ یاب (مفلح) ہو سکتی ہے جو جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک لے جائیں اور یہ کم از کم مواقع بھی صرف معروف (RECOGNISED) طریق سے حیا کئے جائیں اور ڈاکٹر انون کی تحقیق یہ ہے کہ

> انسانیت کی پوری کی پوری تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی اس قسم کی نہیں مل سکتی کہ کوئی ایسی سوسائٹی تمدن کی بلندی تک پہنچ گئی ہے جس کی لڑکیوں کی پرورش و تربیت "مطلق وحدتِ زوج" کی روایات میں نہ ہوئی ہو۔ نہ ہی تاریخِ عالم میں کوئی ایسی مثال ملتی ہے کہ کسی قوم میں جنسی اختلاط پر حدود و قیود کی روایات ڈھیلی پڑ گئی ہوں اور اس کے باوجود وہ قوم اپنی تمدنی بلندی کو قائم رکھ سکی ہو۔ جب عقدِ نکاح، مساوی حیثیت کے فریقین کا عمر بھر کی رفاقت کا عہد ہو۔ اور نہ میاں اپنی بیوی کے علاوہ کسی اور عورت سے آشنا ہو اور نہ ہی بیوی اپنے میاں کے علاوہ کسی مرد کی شناسا۔ تو اس صورت میں جنسی مواقع اپنی کم از کم حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ تاریخ کا مطالعہ اس پر شاہد ہے کہ جن اقوام نے ایسی معاشرتی رسوم اختیار کر لی تھیں جو زندگی بھر کی جبری رفاقت کے قریب قریب پہنچ گئی ہوں (اس لئے کہ اس وقت تک "زندگی بھر کی جبری رفاقت" تک کوئی قوم بھی نہیں پہنچ سکی)۔ اور جن اقوام نے جنسی اختلاط کے حدود و قیود کو زیادہ سے زیادہ عرصہ تک قائم رکھا تھا۔ وہی اقوام تہذیب و تمدن کی اس بلندی تک پہنچ سکی تھیں جہاں تک انسانیت اس وقت تک پہنچ سکی ہے۔ (صفحہ ۳۸۴)

سن رہے ہو سلیم! قرآن نے اس حقیقت کو چودہ سو سال پہلے اس زمانے میں بیان کیا جب یہ چیز کسی کے تصور میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ

جنسی اختلاط کے مواقع کا کوئی تعلق تہذیب و تمدن سے بھی ہو سکتا ہے۔ اور ڈاکٹر انون آج اپنی آزادانہ تحقیق کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ دیکھا تم نے کہ زمانے کی علمی شہادتیں کس طرح قرآنی حقائق کی تائید کرتی چلی جارہی ہیں اور دنیا کس طرح (غیر شعوری طور پر خود بخود) قرآن کے قریب آتی جارہی ہے!

ڈاکٹر انون نے اپنی تحقیق کے دوران میں ضمناً مسلمانوں (عربوں) کی تاریخ کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ مختصر الفاظ میں بتاتا ہے کہ قدیم عرب، قبل از نکاح عصمت و بکارت پر زور نہیں دیا کرتے تھے۔ بعد میں (اسلام کی تعلیم کے ماتحت) انھوں نے اس عصمت پر شدت سے زور دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے محدود ملک سے نکل کر گرد و نواح کی دنیا پر پھیل گئے۔ اس کے بعد انھوں نے تعدد ازواج شروع کر دیا تو ان کی فتوحات کی وسعتیں رک گئیں۔ (ص ۴۲۹) اس کے بعد ڈاکٹر انون نے ایک اور تاریخی عنصر کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ قرآن نے یہود و نصاریٰ (اہل کتاب) کی لڑکیوں سے شادی کی اجازت کیوں دی تھی۔ ڈاکٹر انون کے اس اصول کا ذکر پہلے آچکا ہے کہ کسی قوم کی تمدنی تعمیر میں عورت کی مرتکز توانائی کا بہت بڑا اثر ہے۔ بلکہ یہ کہ مردوں کی توانائی بھی اسی صورت میں تعمیری نتائج پیدا کر سکتی ہے جب ان کی عورتیں باعصمت ہوں۔ ڈاکٹر انون کہتا ہے کہ جب تعدد ازواج سے عربوں کی فتوحات کا سلسلہ مصر میں جا کر رک گیا تو انھوں نے عیسائیوں اور یہودیوں کی لڑکیوں سے شادی کی۔ ان لڑکیوں کی تربیت اس ماحول میں ہوئی تھی جس میں جنسی ضبط (بلکہ جنسی تجرد کی زندگی) پر بڑا زور دیا جاتا تھا۔ ان لڑکیوں کی مرتکز توانائیاں عربوں کی مزید وسعتوں اور تمدنی بلندیوں کا باعث بن گئیں۔ یہی کچھ مصر میں ہوا اور یہی کچھ اسپین میں۔ (ص ۴۲۹) کسی کو ڈاکٹر انون کی تحقیق کے اس نتیجے سے اختلاف ہو یا اتفاق، لیکن یہ حقیقت بہرکیف اپنی جگہ پر غیر متنازعہ رہ جاتی ہے کہ اس محقق کے نزدیک کسی قوم کی فتوحات کی وسعتوں اور تہذیب کی بلندیوں پر اس کی عورتوں کی عصمت و ضبط کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے اور یہی حقیقت قرآن نے بیان کی ہے جب اس نے زندگی کی کامرانیوں کے لئے مردوں اور عورتوں دونوں کے "محصن" (قلعہ بند) ہونے کو بنیادی شرط قرار دیا ہے۔ مرد اور عورت دونوں کا محصن ہونا جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم درجے تک لے آتا ہے (یعنی زمانہ قبل از نکاح میں مطلق عصمت۔ نکاح میں وحدتِ زوج۔ MONOGAMY۔ بطور اساسی اصول۔ اور نکاح کے بعد میاں اور بیوی کا کسی غیر عورت یا مرد کے ساتھ اختلاط ناجائز)۔ لیکن جب کسی قوم میں جنسی اختلاط کے مواقع زیادہ سے زیادہ ہو جائیں (جس کی شکل صرف زنا ہی نہیں بلکہ بلا اس تمدنی ہنگامی ضرورت کے جس کا ذکر قرآن نے کیا ہے، بیک وقت ایک سے زیادہ بیویاں، طلاق کی رخصت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر آزادانہ تبدیلیٔ ازواج اور لونڈیوں کی بھرمار سے سینکڑوں عورتوں سے اختلاط، یہ سب جنسی اختلاط کے زیادہ سے مواقع بہم پہنچانے کی شکلیں ہیں) تو پھر اس قوم میں نہ تو آگے بڑھنے کی توانائیاں رہ جاتی ہیں اور نہ ہی اپنے تمدن کو عالی حالہ قائم رکھنے کی صلاحیتیں باقی۔ اس قسم کی قوم زندگی کی کس سطح پر پہنچ جاتی ہے اس کے متعلق ڈاکٹر انون لکھتا ہے کہ

اس قوم میں علم و بصیرت کی قوت تو ہوتی ہے لیکن وہ اپنے معاملات میں اس سے راہنمائی حاصل نہیں کرتی۔[1] وہ واقعات کے

---

[1] دیکھئے! یہ الفاظ کس طرح ترجمہ ہیں قرآن کی اس آیت کا کہ

لہم قلوب لا یفقہون بہا۔ ان کے پاس سمجھنے کی قوت تو ہوتی ہے لیکن وہ اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے!

اسباب و علل (CAUSES) کے متعلق کبھی تحقیق نہیں کرتی۔ جو کچھ ہوتا ہے اسے اسی طرح تسلیم کرتی چلی جاتی ہے۔ زندگی سے متعلق تمام معاملات کے بارے میں ان کی بندھی بندھائی رائے ہوتی ہے (جس کے مطابق وہ چلتے چلے جاتے ہیں) ...... وہ ہر غیر معمولی واقعہ کو جو ان کی سمجھ میں نہ آئے، کسی عجیب و غریب قوت کی طرف منسوب کر دیتے ہیں ...... اس قوت کا مظہر کبھی پتھروں کو سمجھا جاتا ہے اور کبھی درختوں کو۔ کبھی ایسے حیوانات کو جو انھیں غیر العقول نظر آئیں اور کبھی دیگر ایسی اشیاء کو جن کی ماہیت ان کی سمجھ میں نہ آئے۔ جس شخص کی پیدائش یا زندگی میں انھیں کوئی غیر معمولی بات نظر آئے وہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ اس قوت کا مالک ہے۔ حتیٰ کہ اس کی موت کے بعد بھی اسے اس قوت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ (اس کے بعد ڈاکٹر انون نے ان توہم پرستیوں کی تفاصیل بتائی ہیں جو نذر نیاز، گنڈہ تعویذ، اکابر پرستی اور قبر پرستی کی صورت میں ایسی قوم سے ظہور میں آتی ہیں۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ) ۔ اس قسم کے معتقدات اس قوم میں نسلاً بعد نسل متوارث چلے آتے ہیں۔ زمانہ کا امتداد ان پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس معاشرہ میں انسان پیدا ہوتے ہیں۔ اپنی خواہشات کو پورا کرتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ اور جب ان کی لاشوں کو تہ خاک دبا دیا جاتا ہے تو وہ نسیاً منسیا ہو جاتے ہیں۔ یہ انسان نہیں ہوتے، بالکل حیوان ہوتے ہیں (ص ۳۴۶-۳۴۵)

تم نے دیکھ لیا سلیم، نقشہ اس سوسائٹی کا جس میں جنسی اختلاط کے مواقع زیادہ سے زیادہ ہوتے ہیں؟ کیا مسلمانوں کی صدیوں سے یہی حالت نہیں چلی آرہی اور کیا آج بھی ساری دنیا میں مسلمانوں کی یہی حالت نہیں؟ کیا یہ نتیجہ نہیں جنسی اختلاط کے مواقع کی ان وسعتوں کا جو ان کے خود ساختہ مذہبی تصورات نے انھیں عطا کر رکھی ہیں اور جنھیں "ازروئے شریعت" بالکل جائز بلکہ ثواب کا کام سمجھا جاتا ہے؟

یہ تو ہے ہمارے اس طبقے کی حالت جسے قدامت پرست کہا جاتا ہے۔ ان کے برعکس ہمارے نوجوانوں کا طبقہ ہے جنھوں نے مغرب کی دیکھا دیکھی یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ جنسی تعلقات پر پابندیاں عائد کرنا، انفرادی آزادی کو مقید کرنا ہے اس لئے "ازمنۂ مظلمہ کے ان اغلال و سلاسل کو جتنی جلدی توڑ دیا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ چنانچہ انھوں نے عملاً انھیں توڑنا بھی شروع کر دیا ہے۔ ان آزادیوں سے وہ سوسائٹی متشکل ہوتی ہے جس کے متعلق انون لکھتا ہے کہ اس میں

> ہر لڑکی کو آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ جس قسم کا جنسی کھیل کھیلنا چاہے کھیلتی پھرے اور جس نوجوان سے چاہے جنسی اختلاط قائم کرے۔ اس کے لئے فقط ان دونوں کی رضامندی کی شرط ہے۔ نہ لڑکی پر کسی قسم کی پابندی عائد ہوتی ہے نہ لڑکے پر ... بچپن ہی سے وہ ہر ایسا جنسی کھیل کھیلنے لگ جاتے ہیں جن میں انھیں لذت ملتی ہو ...... مختصراً یہ کہ وہ ایک ایسی فضا میں رہتے ہیں جس میں جنسی حدود و قیود کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور جس میں ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جونہی جنسی خواہش ہوئی، اسے اسی وقت کسی نہ کسی طرح پورا کر لیا۔ (ص ۳۴۸)

یہی ہیں وہ جنسی آزادیاں، سلیم! جن کا متمنی ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن ان آزادیوں کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اسے خود ڈاکٹر انون کی زبان سے سن لو۔ وہ کہتا ہے کہ

لوگ چاہتے یہ ہیں کہ جنسی پابندیوں کو بھی ہٹا دیا جائے اور وہ زندگی کی ان خوشگواریوں سے بھی متمتع ہوتے رہیں جو ایک بلند تمدن کا ثمرہ ہوتی ہیں۔ لیکن انسانی ہیئت تو کچھ اس قسم کی واقعہ ہوئی ہے کہ یہ دونوں آرزوئیں کبھی یک جا جمع نہیں ہوسکتیں۔ یہ ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔ جو ان دونوں میں مفاہمت کی کوشش کرتا ہے اس کی مثال اس احمق بچے کی سی ہے جو چاہتا ہے کہ وہ اپنے کیک کو کھا بھی لے اور پھر وہ سالم کا سالم باقی بھی بچ جائے۔ کوئی انسانی معاشرہ ہو اسے ان دو راہوں میں سے ایک راہ اختیار کرنی ہوگی۔ یا تو ان صلاحیتوں کو پائندہ رکھنے کی راہ جو اس کے تمدن کو بلند کرتی ہیں اور یا جنسی آزادی کی راہ۔ تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ جو قوم ان دو متضاد چیزوں کو اکٹھا کرتی ہے وہ اپنی تہذیب کو ایک نسل سے بھی زیادہ آگے نہیں لے جاسکتی۔ (ص۴۱۲)

بنابریں۔

کسی سوسائٹی میں تخلیقی توانائیاں باقی نہیں رہ سکتیں جب تک اس کی ہر نسل ان روایات میں پرورش نہ پائے جو جنسی اختلاط کے مواقع کو کم ازکم حد تک محدود کردیں۔ اگر وہ قوم اس قسم کے نظام کو (جس میں جنسی اختلاط کے مواقع قلیل ترین حد تک محدود کردیئے جائیں) مسلسل آگے بڑھاتی جائے تو وہ شاندار روایات کی حامل رہے گی۔ (ص۴۱۴)

دیکھ لیا تم نے سلیم! کہ تقدیر امم کس طرح اس جنسی اختلاط کے مسئلہ کے ساتھ وابستہ ہے، جس کے متعلق تم سمجھ رہے تھے کہ وہ ایک طبعی تقاضا ہے جس کی جس طرح جی چاہے تسکین کرلینی چاہیئے۔

آخر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کے معاشرے کی تشکیل کس طرح کی جائے جس میں جنسی اختلاط کے مواقع کو کم ازکم حد تک لے جایا جائے اور پھر ایسی صورت پیدا کی جائے کہ جنسی مواقع کی یہ شکل مستقل طور پر قائم رہ سکے تاکہ اس طرح وہ قوم انسانیت کی صلاحیت بخش توانائیوں کی حامل بنتی چلی جائے۔ ڈاکٹر انون نے اپنی کتاب کا خاتمہ اسی سوال (اور اس کے جواب) پر کیا ہے وہ کہتا ہے کہ

تاریخ کے صفحات پر کوئی سوسائٹی ایسی نظر نہیں آتی جو اس کوشش میں کامیاب ہوگئی ہو کہ وہ جنسی اختلاط کے مواقع کو ایک مدت مدید تک، کم ازکم حد تک محدود رکھ سکی ہو۔ میں تاریخی شواہد سے جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر کسی قوم نے ایسی صورت پیدا کرنی ہو تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے مرد اور عورت کو قانوناً مساوی درجہ عطا کرے۔ (ص۴۳۱-۳۲)

سنتے ہو سلیم! یہ محقق کیا کہہ رہا ہے؟ اس کے بعد یہ دیکھو کہ کیا دنیا میں قرآن کے علاوہ کوئی ضابطۂ حیات بھی ایسا ہے جس نے مرد اور عورت کو قانوناً مساوی حیثیت دی ہو؟ قرآن نے کس طرح مرد اور عورت کو قانوناً ایک ہی سطح پر لاکر کھڑا کردیا ہے، اس کی تفصیل میں طاہرہ کے (پہلے) خط[1] میں بیان کرچکا ہوں۔ [تم اسوقت یہاں نہیں تھے اسلئے وہ خط شاید تمہاری نظروں سے نہیں گذرا۔ اسے، اس سے لیکر اب دیکھ لینا] اس کے بعد ڈاکٹر انون لکھتا ہے کہ

---

[1] شائع شدہ طلوع اسلام بابت جون ۱۹۵۳ء

اگر کوئی معاشرہ چاہتا ہے کہ اس کی تخلیقی توانائیاں مدتِ مدید تک بلکہ ابد الآباد تک قائم اور آگے بڑھتی رہیں تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے اپنی تخلیقِ نو کرے۔ یعنی پہلے اپنے مردوں اور عورتوں کو قانوناً مساوی حیثیت دے اور پھر اپنے معاشی اور معاشرتی نظام میں اس قسم کی تبدیلیاں کرے جن سے معاشرہ میں جنسی اختلاط کے مواقع ایک مدتِ مدید تک، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کم از کم حد تک محدود رہیں۔ اس طرح اس معاشرہ کا رخ ثقافتی اور تمدنی ارتقاء کی طرف مُڑ جائیگا۔ اس کی روایات شاندار ماضی اور درخشندہ مستقبل کی حامل ہوں گی۔ وہ تمدن و تہذیب کے اس بلند مقام تک پہنچ جائے گا جس تک آج تک کوئی نہیں پہنچ سکا۔ اور انسانی توانائیاں اس کی ان روایات کو ایک ایسے انداز سے صیقل کرتی جائیں گی جو اس وقت ہمارے حیطۂ ادراک میں بھی نہیں آسکتا۔ (ص ۴۳۲)

قرآن ایک ایسے ہی معاشرہ کی تشکیل چاہتا ہے۔ اس معاشرہ کی بنیاد بھی رکھی جا چکی تھی اور اس کے برگ و بار بھی دنیا کے سامنے آرہے تھے کہ قرآنی نظام، انسانی تصورات کے نیچے دبا دیا گیا۔ اس کے بعد (زندگی کے دوسرے گوشوں کی طرح) جنسی اختلاط کے اس قدر کثیر مواقع پیدا کر دیئے کہ الامان والحفیظ۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمان آج مہذب دنیا میں سب سے پیچھے ہیں اور انہیں خود اپنے آپ سے شرم آرہی ہے۔

لیکن جب قرآن ہمارے پاس موجود ہے تو اس کی روشنی میں پھر سے وہ معاشرہ قائم کیا جا سکتا ہے جسے ڈاکٹر انون انسانی تمدن و تہذیب کی ان بلندیوں کا حامل قرار دیتا ہے جو آج ہمارے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آسکتیں۔ یہ وہ معاشرہ ہوگا جس میں (قرآن کے مطابق) مرد اور عورت قانوناً ایک سطح پر ہوں گے۔ جنسی اختلاط کے مواقع کم از کم حد تک محدود رہیں گے اور معاشی نظام میں ایسی تبدیلیاں آجائیں گی جن سے یہ صورتِ حالات دوام حاصل کرلے۔

میری ساری کوششوں کا ماحصل یہی ہے سلیم! کہ قوم کی توجہات کا رخ اس قرآنی معاشرہ کی طرف موڑ سکوں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

والسلام

پرویز

دیکھئے اپنا نمبر خریداری تلاش کیجئے

اکتوبر کی اس اشاعت کے ساتھ آپ حضرات کا چندہ جن کے نمبر خریداری درج ذیل ہیں ختم ہو گیا ہے۔ لہٰذا آئندہ ماہ نومبر ۱۹۵۳ء کا پرچہ آپ کو از رمت میں وی پی بھیجا جائے گا۔ اگر مناسب خیال فرمائیں تو ۲۰ اکتوبر ۱۹۵۳ء سے پہلے پہلے آپ اپنا چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرما دیں کہ اس میں ادارہ کو سہولت اور آپ کی کفایت ہے۔ (فہرست خریداران جن کا چندہ ختم ہو گیا) ۲۶۰ - ۴۰۴ - ۵۲۳ - ۵۸۸ - ۵۸۹ - ۵۹۰ - ۵۹۲ - ۵۹۶ - ۶۰۲ - ۱۱۳۰ -

۱۱۳۱ - ۱۱۳۲ - ۱۱۳۳ - ۱۱۳۴ - ۱۱۳۵ - ۱۱۳۶ - ۱۱۳۷ - ۱۱۳۸ - ۱۱۳۹ - ۱۱۴۲ - ۱۱۴۵ - ۱۱۴۶ - ۱۱۴۷ - ۱۱۴۸ - ۱۱۴۹ - ۱۱۵۰ -

۱۱۵۱ - ۱۱۵۲ - ۱۱۵۳ - ۱۱۵۴ - ۱۱۵۶ - ۱۱۶۱ - ۱۱۶۳ - ۱۱۶۶ -

مسلمانوں میں ملائیت کی ابتدا

تاریخ کی روشنی میں

اس سے پیشتر دو اقساط میں بتایا جاچکا ہے کہ مسلمانوں میں ملوکیت اور سرمایہ داری کی ابتدا کس طرح ہوئی۔ زیرِ نظر قسط میں یہ دکھایا جائے گا کہ مسلمانوں میں ملائیت کی ابتدا کس طرح سے ہوئی۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی بصراحت لکھ چکے ہیں، ہماری اس تحقیق کا مدار لامحالہ اس مسالہ پر ہے جو ہماری تاریخ ہمیں بہم پہنچاتی ہے۔ تاریخ کو یقین کا درجہ حاصل نہیں، لیکن جب کسی مسئلہ پر تاریخی نقطۂ نگاہ سے بحث کی جائے گی تو اس کے متعلق اس قوم کی تاریخ ہی سے مدد لی جائے گی۔ بنابریں اگر کسی کو ان نتائج سے اختلاف ہو جن تک ہم اپنے مضمون کی پہلی دو قسطوں میں پہنچ چکے ہیں یا جن تک اس قسط میں پہنچا جائے گا تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اس کے نزدیک تاریخ نے اصل واقعات کو ہم تک نہیں پہنچایا۔ اس صورت میں ہمیں بھی اس پر اصرار نہیں ہوگا کہ نتائج مستخرجہ کو بالضرور صحیح تسلیم کیا جائے۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ باقی رہے گی کہ جب تک ہم اپنی اس تاریخ کو مستند سمجھتے ہیں اس وقت تک ہمیں ان نتائج کو بھی صحیح سمجھنا ہوگا۔ یہ غلط ہوگا کہ آپ اپنی تاریخ کو تو مستند سمجھیں اور اس سے مستخرجہ نتائج کو اٹھا کر پھینک دیں۔

تاریخ کی روشنی میں ملائیت کی ابتدا سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ملائیت کے معنی کیا ہیں۔ جیسا کہ طلوعِ اسلام کی ہر اشاعت میں دہرایا جاتا ہے، اسلام نے زندگی کا ایک نظام دیا جس کے اصولی احکام و ضوابط قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بتایا کہ ملت کی ہیئتِ اجتماعیہ ان کے نمائندوں پر مشتمل ہوگی جن کا ایک امیر ہوگا۔ قرآن نے جن امور کے اصول بتائے ہیں ملت کی یہ ہیئتِ اجتماعیہ ان اصولوں کی روشنی میں اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزئیات کا خود فیصلہ کرے گی۔ اس طرح سے فیصل شدہ جزئیات حکومت کی مہر کے ساتھ نافذ ہوں گی۔ انہی کو ملک کا قانون کہا جائیگا۔ ظاہر ہے کہ اس نظام میں اشخاص اور افراد کی کوئی نجی حیثیت نہیں رہتی۔ حتیٰ کہ خود امیر المومنین کی بھی ذاتی حیثیت کچھ نہیں ہوتی۔ افرادِ ملت کو جب بھی کسی معاملہ کے متعلق دریافت کرنا ہوگا کہ اس میں شریعت کا حکم کیا ہے۔ انھیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اس بارہ میں نظامِ مملکت کی طرف سے نافذ شدہ قانون کونسا ہے۔ اگر کوئی قانون نہیں ملے گا تو وہ اس مسئلہ کو اربابِ حکومت تک پہنچائیں گے اور وہاں سے جو فیصلہ ملے گا وہی اس باب میں شریعت کا فیصلہ ہوگا۔

اس کے برعکس دوسرا تصور یہ ہے کہ اگر کسی کو یہ معلوم کرنا ہو کہ فلاں معاملہ میں شریعت کا حکم کیا ہے تو اسے کسی ایسے

شخص کی طرف رجوع کرنا چاہئے جو علوم شریعت کا واقف ہو، وہ اس بارہ میں جو فتویٰ دے اسے شریعت کا حکم سمجھ لیا جائے۔ حتیٰ کہ اگر مسلمانوں کی حکومت (یعنی نمائندگان ملت مع ان کے امیر) کو بھی شریعت کا منشا معلوم کرنے کیلئے کسی ایسے عالم یا علماء کی جماعت کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ حکومت اس کی پابند ہوگی کہ وہ اس عالم یا علماء کی جماعت کی رائے کو شریعت کا حکم تسلیم کرے اور اس کے مطابق قانون نافذ کرے۔ اگر ملت کے نمائندوں کی یہ مجلس اور ان کا امیر ان علماء کی رائے کے خلاف فیصلہ کردے تو اسے شریعت کی خلاف ورزی قرار دیا جائے گا۔ اول الذکر نظام کو قرآنی نظامِ شریعت کہا جائے گا اور ثانی الذکر کو ملائیت۔ سوال زیر غور یہ ہے کہ مسلمانوں میں پہلی قسم کا نظام کب تک رہا اور دوسرے تصور کی ابتدار کب اور کن حالات میں ہوئی۔

یہ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلعم نے قرآنی نظام قائم کیا۔ آپ کو خدا کی طرف سے حکم تھا کہ وشاورھم فی الامر۔ زندگی کے معاملات میں ملت سے مشورہ کیا کرو۔ جب کوئی ایسا معاملہ پیش آتا جس کی جزئیات خود قرآن نے متعین نہیں کی تھیں تو نبی اکرم صلعم قرآن کے اصول کی روشنی میں جماعتِ صحابہؓ سے مشورہ کرتے اور اس مشاورت سے جو حکم نافذ فرماتے وہ اسلامی شریعت کا قانون قرار پا جاتا۔ اس فیصلہ کی پابندی ہر مسلمان پر از روئے قرآن فرض تھی اور اس سے سرتابی کا نام معصیت رسول تھا۔

رسول اللہ صلعم کے بعد یہی سلسلہ نظامِ قرآنی حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں قائم رہا۔ ان کے سامنے جب کوئی ایسا معاملہ آتا جس کے متعلق قرآن نے جزئیات متعین نہیں کی تھیں تو وہ یہ دیکھتے کہ کیا یہ معاملہ اس سے پہلے مجلس مشاورت اور رسول اللہ صلعم کے سامنے آیا تھا اور اگر آیا تھا تو اس کے متعلق کیا فیصلہ ہوا تھا (تاکہ اس مسئلہ کی دوبارہ بلاضرورت چھان بین نہ کی جائے) اگر یہ دیکھا جاتا کہ اس فیصلہ میں تبدیلیٔ حالات سے کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں تو اسے علیٰ حالہٖ رہنے دیا جاتا، لیکن اگر اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوتی تو اسے مناسب تبدیلی کے بعد نافذ کر دیا جاتا۔ اب یہی فیصلے نظامِ اسلامی کی رو سے شریعت کے احکام قرار پاتے۔ انہی کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت کے مرادف ہوتی اور ان سے انکار خدا اور رسول کی معصیت۔

چونکہ اس زمانے میں دفتری نظام اس قسم کا نہیں تھا کہ ہر چھوٹا بڑا فیصلہ کتاب میں درج ہو جاتا اور سرکاری گزٹ میں اس کا باقاعدہ اعلان کر دیا جاتا نہ ہی رسول اللہ صلعم نے اپنے فیصلوں کا کوئی مجموعہ مرتب کر کے یا مرتب کرا کے پیچھے چھوڑا تھا اس لئے یہ دیکھنے کے لئے کہ فلاں مسئلہ اس سے پیشتر زیر بحث آچکا ہے یا نہیں لوگوں کی شہادات طلب کی جاتی تھیں۔ چنانچہ تاریخ میں اس قسم کے بیشمار واقعات موجود ہیں جن میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ نے یہی راہ اختیار فرمائی۔ مثلاً

(۱) ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں بہ سند روایت کی ہے کہ دادی[1] حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں اپنا حق وراثت مانگنے کیلئے آئی لیکن انھوں نے کہا کہ میں کتاب اللہ میں تمہارا کوئی حصہ نہیں پاتا اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ رسول اللہ صلعم نے تمہارا کوئی حصہ مقرر فرمایا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے لوگوں سے دریافت کیا تو مغیرہؓ کھڑے ہوگئے اور کہا کہ میں نے

---

[1] دادی نہیں بلکہ نانی۔ جیسا کہ مؤطا کی روایت میں آگے مذکور ہے۔

سنا ہے کہ رسول اللہ صلعم اس کو چھٹا حصہ دیتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کیا تمہارا کوئی مؤید ہے؟ حضرت محمد بن مسلمہؓ نے بھی شہادت دی تو انھوں نے اس کو بھی حصہ دلوادیا۔ (تاریخ فقہ اسلامی ص۱۶۵)

(۲) ہشام نے اپنے باپ مغیرہ بن شعبہ سے روایت کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے صحابہؓ سے عورت کے ساقط کردہ حمل (یعنی جو کسی کے مارنے پیٹنے سے ساقط ہوجائے) کی دیت کے بارہ میں مشورہ کیا تو مغیرہؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلعم نے اسکی دیت ایک لونڈی یا غلام دلوائی ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اگر تم سچے ہو تو ایک اور آدمی کو بھی لاؤ جو اس کو جانتا ہو تو محمد بن مسلمہؓ نے بھی یہی شہادت دی۔ (ایضاً ص۱۶۶)

(۳) امام مالکؒ نے موطاء میں روایت کی ہے کہ ایک جدہ (یعنی نانی) حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں اپنی میراث (یعنی نواسے کے ترکہ سے حصہ) مانگنے آئی۔ انھوں نے فرمایا کہ قرآن مجید میں تمہارا کوئی حصہ نہیں اور حدیث میں بھی ہم کو تمہارا حصہ معلوم نہیں ہوتا، اس وقت واپس جاؤ تاکہ ہم لوگوں سے دریافت کرلیں۔ انھوں نے لوگوں سے دریافت کیا تو مغیرہ بن شعبہؓ نے کہا کہ میرے سامنے رسول اللہ صلعم نے نانی کو چھٹا حصہ دیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کیا تمہارے علاوہ بھی کوئی اس کی شہادت دے سکتا ہے؟ حضرت محمد بن مسلمہؓ نے بھی کھڑے ہوکر یہی بات کہی اور حضرت ابوبکرؓ نے اس کو چھٹا حصہ دلوایا۔ اس کے بعد دوسری جدہ (یعنی حقیقی دادی) حضرت عمر بن الخطابؓ کی خدمت میں اسی غرض سے حاضر ہوئی، تو انھوں نے فرمایا قرآن مجید میں تمہارا کوئی حصہ نہیں اور رسول اللہ صلعم اور حضرت ابوبکرؓ کا فیصلہ تمہارے لئے نہ تھا بلکہ نانی کے لئے تھا۔ (ایضاً ص۱۸۰)

اس قسم کی مثالیں اور بھی بہت سی پیش کی جاسکتی ہیں مگر مقصد پیش نظر کے لئے اتنی ہی کافی ہیں۔ ان مثالوں میں آپ نے دیکھا کہ مرکز ملت کی طرف سے اس کی جستجو کی جاتی ہے کہ ان مسائل میں ہم سے پہلے امیرملت کا کوئی فیصلہ موجود ہے یا نہیں۔ اور جب وہ فیصلہ مل جاتا ہے اور اس میں تغیر و تبدل یا ترمیم و تنسیخ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تو اس کو علیٰ حالہ قائم رکھا جاتا ہے۔ لیکن اگر ترمیم و تنسیخ یا ردوبدل کی ضرورت محسوس ہوتی تھی تو ان جزئیات میں ردوبدل یا ترمیم و تنسیخ بھی کردی جاتی تھی۔ کتب روایات میں اس قسم کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً

(۱) امام مسلم اور امام احمد بن حنبل نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلعم اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں، اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے دو سال تک اگر ایک ساتھ تین طلاقیں دی جاتی تھیں تو وہ ایک ہی شمار کی جاتی تھیں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جو کام تمہل و تامل کا تھا اس میں لوگوں نے جلد بازی کردی تو ہم بھی ان کی سزا کے لئے اس کو نافذ کردیں، چنانچہ انھوں نے اس کو نافذ کردیا لیکن اور صحابہؓ نے اس پر اتفاق نہیں کیا بلکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے اس کے خلاف روایت موجود ہے۔ ؎۱ (تاریخ فقہ اسلامی ص۱۷۶)

؎۱ قرآن کی رو سے طلاق کی صورت کیا ہے اس کے متعلق طلوع اسلام میں تفصیل سے لکھا جاچکا ہے۔

(۲) کچھ لوگوں نے اسلام ظاہر کیا، یہ اپنی قوم کے سردار تھے۔ خدا نے صدقات میں ان کا حصہ مقرر فرما دیا تھا اور رسول اللہ کو حکم تھا کہ تالیف قلب اور تثبیت ایمان کے لئے ان لوگوں کو کچھ دیا جائے، یہی لوگ مؤلفۃ القلوب کہلاتے ہیں۔ قرآن نے صریحاً ان کا ذکر فرمایا ہے۔ (انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیہا والمؤلفۃ قلوبھم) رسول اللہ صلعم مال فئے اور مال زکوٰۃ سے ان لوگوں کو عطا فرمایا کرتے تھے چنانچہ ابوسفیان، اقرع بن حابس، عباس بن مرداس، صفوان بن امیہ اور عیینہ بن حصن کو آپ نے عطایا دیئے۔ اور ایک ایک کو سو سو اونٹ عطا فرما دیئے۔ جب ابوبکر صدیق رض خلیفہ ہوئے تو وہ بھی رسول اللہ صلعم کی طرح ان لوگوں کو عطا فرماتے رہے۔ چنانچہ عیینہ بن حصن اور اقرع بن حابس ان کے پاس آئے اور ایک زمین مانگی، ابوبکر صدیق رض نے اس زمین کے دیئے جانے کیلئے حکم نامہ تحریر فرما دیا۔ اس کے بعد حضرت عمر رض خلیفہ ہوئے تو یہ دونوں ان کے پاس پہنچے تاکہ حضرت ابوبکر رض کے حکمنامہ کے مطابق اس زمین کا قبضہ حضرت عمر رض سے حاصل کر لیں لیکن حضرت عمر رض نے اس حکمنامہ کو چاک کر ڈالا اور فرمایا "خدا نے اسلام کو عزت و غلبہ عطا کر دیا ہے۔ اب اسے تمہاری ضرورت نہیں رہی۔ اگر تم اسلام پر ثابت قدم رہو فبہا ورنہ ہمارے اور تمہارے درمیان تلوار فیصلہ کردیگی"۔ اور اس کے بعد اس گروہ کا جو زکوٰۃ میں مقررہ حصہ چلا آرہا تھا اسے بالکلیہ موقوف کر دیا۔ (الفاروق عمر ص۲۹۸)

(۳) حضرت عمر رض اور آپ کے اصحاب کے درمیان فتح شام کے بعد نزاع اور بحث شروع ہوگئی اور صحابہ ان سے دو تین روز تک برابر بحث کرتے رہے۔ مسلمانوں کی ایک جماعت کا خیال تھا کہ حضرت عمر رض سرزمین شام کو مجاہدین کے درمیان اسی طرح تقسیم کر دیں جس طرح رسول اللہ صلعم نے سرزمین خیبر کو تقسیم فرما دیا تھا۔ اس مطالبہ میں حضرت زبیر بن العوام اور حضرت بلال بن رباح بہت پیش پیش تھے۔ لیکن حضرت عمر رض نے انھیں وہی جواب دیا جو سرزمین عراق کے بارہ میں بحث کرنے والوں کو جواب دیا تھا کہ "تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں بعد میں آنے والے مسلمانوں کو اس حالت میں چھوڑ جاؤں کہ ان کیلئے کچھ بھی باقی نہ رہے۔ چنانچہ حضرت عمر رض نے وہ زمین تقسیم نہیں کی بلکہ ان زمینوں کو ان پر کام کرنے والوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا تاکہ ان کا خراج مسلمانوں کے عطایا میں کام آئے۔ (الفاروق عمر ص۲۹۸ ج۲)

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے مسائل ہیں جن میں حضرت عمر رض نے اپنے زمانے کے حالات کو دیکھتے ہوئے ان جزئیات میں رد و بدل اور ترمیم و تنسیخ سے کام لیا۔ مثلاً

(۱) امہات الاولاد کی بیع و فروخت کو انھوں نے قانوناً بند کر دیا حالانکہ رسول اللہ کی حیات میں اور صدیق اکبر رض کے عہد میں ان کی بیع و فروخت برابر ہوتی تھی، حضرت علی رض نے اپنے عہد خلافت میں پھر چاہا کہ اس کی اجازت دیدیں اور فرمایا کہ ان کی بیع و فروخت کی ممانعت ایک رائے تھی جس پر ان کا اور عمر رض کا اتفاق ہوگیا تھا تو ان کے قاضی عبیدہ سلمانی نے کہا کہ آپ کی اور عمر رض کی دونوں کی رائے جماعت میں آپ کی تنہا رائے سے زیادہ پسند ہے تو اس پر حضرت علی رض نے فرمایا "اچھا جیسا کہ فیصلے کرتے آرہے ہو اسی طرح فیصلے کرتے رہو کیونکہ حضرت علی رض نے اختلاف کو پسند نہیں فرمایا (الفاروق عمر ص۲۸۶)

(۵) رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں شراب خوری کی کوئی حد مقرر نہیں تھی مگر حضرت عمرؓ نے صحابہؓ سے مشورہ کرنے کے بعد شراب خوری کی حد چالیس کوڑے مقرر فرمادی۔

(۶) حضورؐ کے زمانہ میں اور صدیق اکبرؓ کے عہد میں عطایا اور وظائف میں کوئی امتیاز نہیں تھا بلکہ مال کی تقسیم برابر سرابر کی جاتی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں امتیاز قائم کیا اور لوگوں کے وظائف ان کے شرف، مرتبہ اور سبقت اسلامی کے اعتبار سے مقرر کئے۔ لیکن جب آخر عمر میں اس امتیاز کی وجہ سے فسادات ظاہر ہونے لگے تو ارادہ فرمایا کہ اس امتیاز کو مٹا کر پھر مساوات کو قائم کردیں مگر عمرؓ نے وفا نہ کی اور اس ارادہ کو عملی جامہ نہیں پہنا سکے۔

(۷) رسول اللہ صلعم اور صدیق اکبرؓ کے عہد میں گھوڑوں پر کوئی زکوٰۃ نہیں لی جاتی تھی لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں گھوڑوں پر زکوٰۃ واجب قرار دی۔

مذکورہ بالا مثالوں سے آپ نے دیکھ لیا کہ جب کوئی مسئلہ پیش آتا تھا اور کتاب اللہ میں اس کا کوئی حکم نہیں ملتا تھا تو مرکز ملت کو خود اس کی جستجو ہوتی تھی کہ اس مسئلہ میں پہلے امیر ملت کا کوئی فیصلہ موجود ہے یا نہیں اگر ہے تو کیا ہے۔ حضرات صحابہؓ ایسے مواقع پر آزادی کے ساتھ رسول اللہ صلعم یا صدیق اکبرؓ وغیرہ کے فیصلے نقل کرتے تھے۔ ان کی تصدیق کی جاتی تھی اور اس کے بعد غور کیا جاتا تھا کہ اس فیصلہ کو علیٰ حالہ قائم رکھا جائے یا اس میں کسی ردوبدل اور ترمیم و تنسیخ کی ضرورت ہے۔ اگر زمانہ کے حالات اور تقاضے کسی ردوبدل یا ترمیم و تنسیخ کے متقاضی نہیں ہوتے تھے تو ان فیصلوں کو علیٰ حالہ نافذ کردیا جاتا تھا اور اگر زمانے کے حالات اور تقاضے اس میں ردوبدل یا ترمیم و تنسیخ کے متقاضی ہوتے تھے تو ان میں ردوبدل اور ترمیم و تنسیخ کردی جاتی تھی۔ بہرحال ان تمام مثالوں میں آپ نے یہ چیز دیکھی ہے کہ ان جزئیات کے متعلق جن کی تعیین کتاب اللہ نے نہیں کی ہے خود امیر ملت کی طرف سے رسول اللہ صلعم اور صدیق اکبرؓ وغیرہ کے فیصلوں کی جستجو کی جاتی تھی اور امیر ملت کے دربار میں لوگ آزادی کے ساتھ ان فیصلوں کو پیش کرتے تھے۔ اگرچہ ان فیصلوں کو قانونی حیثیت اسی وقت حاصل ہوتی تھی جبکہ امیر ملت اپنے اہل حل و عقد سے مشورہ کرنے کے بعد ان کی موافقت یا مخالفت میں اپنا کوئی فیصلہ دیدیتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ اس دور میں اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی کہ لوگ اپنے طور پر رسول اللہ صلعم کی حدیثوں کو بیان کرتے رہیں اسلئے کہ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے رسول اللہ صلعم کے فیصلے بھی اسی وقت قانون کی حیثیت حاصل کرتے تھے جب وہ قرآنی نظام ملت کی طرف سے بطور قانون رائج الوقت نافذ کئے جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب بھی کوئی مسئلہ پیش آتا تو اس کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جاتا نہ کہ افراد صحابہؓ کی طرف۔ یہی نہیں کہ اس زمانے میں لوگ انفرادی طور پر حدیثیں بیان نہیں کرتے تھے بلکہ حکومت کی طرف سے ایسا کرنے کی سخت مخالفت ہوتی تھی چنانچہ کتب روایات میں اس کی بھی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً

(۱) دراوردی نے محمد بن عمرو اور محمد بن عمرو نے ابی سلمہ سے اور ابی سلمہ نے ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ میں نے ان سے کہا کہ کیا تم حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی اسی طرح روایت کرتے تھے؟ بولے جس طرح میں تم سے روایت کرتا ہوں اگر اسی طرح

حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی روایت کرتا تو وہ مجھے اپنے کوڑے سے مارتے۔

(۲) معن بن عیسیٰ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ ہم کو مالک نے عبداللہ بن ادریس کے ذریعہ سے اور عبداللہ بن ادریس نے شعبہ کے ذریعہ سے اور شعبہ نے سعید بن ابراہیم کے ذریعہ سے اور سعید بن ابراہیم نے اپنے باپ کے ذریعہ سے خبر دی ہے کہ حضرت عمرؓ نے تین شخصوں یعنی عبداللہ بن مسعودؓ، ابوالدرداءؓ اور ابومسعود انصاریؓ کو قید کر دیا تھا اور فرمایا تھا کہ تم نے رسول اللہ صلعم سے بہت زیادہ روایتیں کر دیں۔

(۳) ابن علیہ نے رجاء بن ابی سلمہ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا کہ ہم کو یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت امیر معاویہ کہا کرتے تھے کہ تم لوگ بھی حدیث کے ساتھ وہی طرز عمل اختیار کرو جو حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جاری تھا کیونکہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت حدیث کرنے کے متعلق لوگوں کو سخت دھمکیاں دی تھیں۔ (تاریخ فقہ اسلامی ص ۱۶۲-۱۶۳)

(۴) حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں مراسیل بن ابی ملیکہ سے یہ روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا تم لوگ رسول اللہ صلعم سے ایسی حدیثیں روایت کرتے ہو جن میں تم لوگوں میں اختلاف ہوتا ہے اور تمہارے بعد جو لوگ ہوں گے ان میں اس سے بھی زیادہ اختلاف ہوگا تو رسول اللہ صلعم سے کوئی حدیث روایت نہ کرو۔ جو شخص تم سے سوال کرے اس سے کہو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان خدا کی کتاب ہے اس کے حلال کئے ہوئے کو حلال اور اس کے حرام کئے ہوئے کو حرام سمجھو۔

(۵) حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ شعبہ وغیرہ نے بیان سے اور بیان نے شعبی سے اور شعبی نے قرظہ بن کعب سے روایت کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب ہم کو عراق کی طرف روانہ فرمایا تو ہمارے ساتھ خود بھی چلے اور فرمایا تم کو معلوم ہے کہ میں کیوں تمہاری مشایعت کرتا ہوں؟ لوگوں نے کہا ہاں ہماری عزت افزائی کے لئے۔ بولے اس کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ تم ایسی آبادی کے لوگوں کے پاس جاتے ہو جو شہد کی مکھیوں کی طرح گنگنا گنگنا کر قرآن مجید پڑھتے ہیں، تو تم احادیث کی روایت کرکے ان کی تلاوت قرآن میں رکاوٹ نہ پیدا کرنا۔ صرف قرآن مجید پر بس کرو اور رسول اللہ صلعم سے روایت کم کرو اور اس میں میں بھی تمہارا شریک ہوں۔ چنانچہ جب قرظہ آئے تو لوگوں نے روایت حدیث کی خواہش کی انھوں نے جواب دیا کہ ہم کو عمرؓ نے اس کی ممانعت کی ہے۔ (ایضاً ص ۱۶۱-۱۶۲)

کبار صحابہ کو مدینہ منورہ سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی

اتنا ہی نہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اور حضرت عمرؓ نے انفرادی طور پر روایات کا بیان کرنا منع کر دیا ہو بلکہ حضرت عمرؓ کی دوررس نگاہ تو اس سے بھی آگے پہنچی ہوئی تھی۔ یہ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلعم کے جلیل القدر صحابہؓ بیشتر مدینہ منورہ ہی میں تھے۔ عامۃ المسلمین کی نگاہوں میں ان صحابہؓ کی بڑی عظمت تھی (اور ہونی بھی چاہئے تھی) ظاہر ہے کہ اگر یہ صحابہ مختلف شہروں اور بستیوں میں پھیل جاتے تو وہاں کے لوگ ان کے گرد جمع ہو جاتے اور ہر مسئلہ میں انہی کی طرف رجوع کرتے۔ اس سے نظام حکومت کی اجتماعیت میں خلل واقع ہو جاتا اور

قرآن کے بنائے ہوئے اور رسول اللہ صلعم کے بنائے ہوئے نقشہ میں انتشار پیدا ہو جاتا لہٰذا حضرت عمرؓ نے اس کا التزام کیا کہ ان صحابہؓ کو حتی الامکان مدینہ منورہ سے باہر نہ جانے دیا جائے۔ چنانچہ اگر کسی صحابی کو کسی شدید ضرورت کے لئے باہر جانا ہوتا تو اس کے لئے حضرت عمرؓ سے اجازت حاصل کرنی پڑتی تھی۔ نہ صرف اجازت بلکہ یہ بھی بتانا ہوتا تھا کہ وہ کتنے دن مدینہ منورہ سے باہر رہیں گے اور کب تک واپس آجائیں گے چنانچہ اس بارے میں مشہور مورخ امام طبری امام شعبی سے نقل کرتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کا جب انتقال ہوا تو قریش کے لوگ ان سے قطعاً اکتا چکے تھے کیونکہ انہوں نے ان کو مدینہ منورہ میں قید کر دیا تھا اور ان کو باہر جانے کی قطعاً بندش لگا دی تھی اور فرمایا کرتے تھے کہ اس امت پر مجھے سب سے زیادہ اس بات سے خوف ہے کہ تم لوگ شہروں میں منتشر نہ ہو جاؤ۔ اگر کوئی صحابی جہاد پر جانے کی اجازت مانگتا تھا اور وہ ان مہاجرین صحابہ میں سے ہوتا تھا جو مدینہ منورہ میں مقید تھے (حضرت عمرؓ نے یہ سب کچھ قریش تک کے ساتھ نہیں کیا تھا بلکہ صرف اہل مدینہ و مہاجرین کے ساتھ ہی کیا تھا) تو حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے جو لڑائیاں تم رسول اللہ صلعم کے ساتھ لڑ چکے ہو وہ تمہیں اپنی منزل تک پہنچانے کیلئے کافی اور آج کی لڑائیوں سے بہتر ہیں۔ یہی مناسب ہے کہ نہ تم دنیا کو دیکھو اور نہ دنیا تمہیں دیکھے۔ (تاریخ ابن جریر طبری واقعات ۳۵ھ)

اسی سلسلہ میں امام طبریؒ امام حسن بصریؒ سے نقل کرتے ہیں کہ

حضرت عمر بن الخطابؓ نے مہاجرین قریش کے سرآوردہ صحابہؓ کو بلا اجازت اور بلا تعیین واظہار مدت مدینہ سے باہر دوسرے شہروں میں جانے کی سختی سے ممانعت کر رکھی تھی۔ لوگ اس کے سخت شاکی تھے۔ (ایضاً۔ حوادث ۳۵ھ)

جب تک حضرت عمرؓ زندہ رہے اور ان کی یہ پالیسی باقی رہی مسلمانوں کی مرکزیت قائم رہی۔ ان کا مرکز ملت دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے ان کا صحیح مرکز رہا اور اس میں ذرا سا انتشار بھی نہیں پیدا ہو سکا چنانچہ علامہ محمد حسین ہیکل حضرت عمرؓ کی اس پالیسی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

حضرت عمرؓ نے مدینہ منورہ میں بنو ہاشم، کبار صحابہ اور سربرآوردگان قریش کو محبوس رکھا تاکہ وہ اپنی عقل وافر اور حکمت بالغہ کے ذریعہ حضرت عمرؓ کو مشورہ دے سکیں کیونکہ شوریٰ ہی حکومت کی اصل بنیاد تھی اور چونکہ امیر المومنین کی رائے ہر معاملہ میں آخری رائے اور قول فیصل ہوتی تھی لہٰذا مملکت کے ہر قسم کے مسائل وانتظامات وغیرہ کی تمام تر ذمہ داری انہی پر منتہی ہوتی تھی اور اس کی وجہ سے تسلط کی تمام صورتیں ان کے ہاتھ میں جمع ہو گئی تھیں لہٰذا کتاب اللہ اور سنت رسول کی حدود میں وہی شریعت بنانے والے تھے وہی شریعت کو نافذ کرنے والے، وہی فیصلے کرنے والے تھے اور وہی افواج قاہرہ کے قائد اعلیٰ تھے۔ حضرت عمرؓ ان تمام ذمہ داریوں سے باحسن وجوہ عہدہ برآ ہوئے۔ یہی وہ جامعیت تھی جس نے ان کے نام کو تاریخ میں ہمیشہ کے لئے ثبت کر دیا۔

(الفاروق عمر۔ ج۲ ص۲۱۳)

حضرت عثمانؓ نے اپنے عہد میں تمام بندشیں ڈھیلی کر دیں

لیکن حضرت عمرؓ کی یہ پالیسی ان کی زندگی تک ہی باقی رہی۔ حضرت عثمانؓ نے خلیفہ ہوتے ہی حدیثیں بیان کرنے کی عام اجازت کے ساتھ ہی ساتھ اس پابندی کو بھی اٹھا دیا اور صحابہؓ کو عام اجازت دیدی کہ وہ جہاں چاہیں آئیں جائیں اور جہاں چاہیں قیام کریں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے بڑے صحابہ مختلف شہروں میں منتشر ہوگئے اور مختلف شہروں میں انھوں نے اپنے وطن بنا لئے۔ جو صحابی جس جگہ پہنچا وہاں کے لوگوں نے دینی مسائل اور روزمرہ کے معاملات میں ان سے رجوع کرنا شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ جوں جوں حکومت کی ذمہ داریاں نوجوانوں کو سونپی جانے لگیں حالات اور خراب ہوتے چلے گئے۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ جہاں کوفہ کا گورنر ولید بن عقبہ بن ابی معیط جیسا آدمی ہو جس کی دیانت و امانت تک مسلمانوں میں مشتبہ ہو وہاں اگر کسی کو کوئی اہم معاملہ پیش آتا ہوگا تو وہ اس معاملہ کے متعلق شریعت کا حکم پوچھنے کے لئے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ اور سعد بن ابی وقاصؓ یا ابوموسیٰ اشعریؓ جیسے صحابۂ کبار کی طرف رجوع کرتا ہوگا یا ولید بن عقبہ کی طرف؟ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے کوئی شخص ولید بن عقبہ کی طرف نہیں جاتا تھا۔ بلکہ سب مسلمان ان عظیم المرتبہ حضرات صحابہؓ ہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ روزمرہ کے معاملات کے متعلق لوگ صحابہ کی بیان کردہ روایات کو معمول بہا بنانے لگ گئے اور نمائندگانِ حکومت کے فیصلوں کا دائرہ سمٹتے سمٹتے انہی امور تک محدود رہ گیا جن کا تعلق سلطنت کے انتظامی امور سے ہوتا ہے۔ اس سے نہ صرف اجتماعیت کی جگہ انفرادیت ہی آگئی بلکہ اس سے دین اور سیاست کی ثنویت کی وہ پہلی اینٹ بھی رکھی گئی جس نے آگے چل کر وہ تباہی پیدا کی جس سے مسلمان اس وقت تک نہیں پنپ سکا۔ یہ ظاہر ہے کہ جب حضرت عثمانؓ نے صحابہؓ پر سے یہ پابندیاں اٹھائی ہوں گی تو ان کے وہم و گمان بھی نہیں ہوگا کہ اس اجازت کے نتائج کس قدر دوررس اور خطرناک ہوں گے۔ امام طبریؒ اس باب میں لکھتے ہیں:-

> لیکن جب عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے صحابہؓ کو مطلقاً آزادی دیدی چنانچہ وہ تمام شہروں میں گھومتے پھرتے تھے لوگ ان کی طرف جوق جوق آتے تھے اور اس بنا پر حضرت عثمانؓ بہ نسبت حضرت عمرؓ کے صحابہ میں زیادہ محبوب ہوگئے تھے۔ (تاریخ ابن جریر طبری حوادث ۳۵ھ)

دوسری جگہ امام طبری اپنی سند کے ساتھ محمد اور طلحہ سے نقل فرماتے ہیں:-

> لیکن جب عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے صحابہؓ پر وہ گرفت نہیں کی جو حضرت عمرؓ کیا کرتے تھے۔ چنانچہ یہ لوگ شہروں میں گھومتے پھرتے تھے۔ جب ان صحابہؓ نے ان شہروں اور دنیا کو دیکھا اور لوگوں نے ان صحابہ کو دیکھا تو ان میں سے خصوصیت کے ساتھ وہ حضرات جنھیں اسلام میں کوئی بڑی فضیلت حاصل نہیں تھی انسانوں کے اس سمندر میں گم ہو کر رہ گئے۔ لوگ جوق در جوق ان کے پاس آتے تھے۔ ان کو بڑی بڑی توقعات بندھاتے تھے اور ان کا مقرب بننے کی کوشش کرتے تھے وہ لوگ کہتے تھے کہ کل کو یہ لوگ حاکم ہو جائیں تو ہماری یہ جان پہچان کل کو ہمارے کام آئے گی۔ یہ پہلی کمزوری تھی جو اسلام میں داخل ہوئی اور عوام کیلئے اس سے بڑا اور اس سے پہلا فتنہ کوئی دوسرا فتنہ نہیں ہو سکتا ہے۔ (ایضاً)

اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ اس کے متعلق تاریخ فقہ اسلامی کے مصنف علامہ محمد الخضری لکھتے ہیں۔

علمائے اسلام عام طور پر اسلامی شہروں میں پھیل گئے چنانچہ مدینہ منورہ سے نکل کر بعض صحابہ نے معلم اور بعض نے قاری کی حیثیت سے دوسرے اسلامی شہروں میں سکونت اختیار کرلی، یہانتک کہ یہ نئے شہر ان کے وطن تسلیم کرلئے گئے اور ان کی تعلیم و ارشاد کے ذریعے سے کبار تابعین کی ایک جماعت پیدا ہوگئی جو فتوے میں ان کی شریک ہوئی اور خود صحابہؓ نے اس منصب میں ان کے حق شرکت کو تسلیم کرلیا اور انھوں نے اپنی علمی مشغولیت اور اپنے اجتہاد کے ذریعہ سے جو درجہ حاصل کیا تھا اس کو بلند کردیا۔ اگر مکہ اور مدینہ کا وجود نہ ہوتا۔ اگر مسلمانوں کے دلوں میں ان دونوں مقامات کی عام وقعت نہ ہوتی۔ اگر مکہ حج کا مقام نہ ہوتا اور مختلف العقیدہ اور مختلف المیلان مسلمان وہاں آمد و رفت نہ رکھتے تو دور دراز شہروں کے علماء میں علمی تعلق قائم نہ ہوسکتا۔

چونکہ روایت حدیث کی رکاوٹ کا سبب دور ہوگیا اسلئے روایتِ حدیث کا عام رواج ہوا۔ چنانچہ خلفائے راشدین کے بعد جو صحابہؓ رہ گئے تھے ان کے پاس دوسرے شہروں سے فتویٰ اور تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے لوگ آتے تھے۔ تمدن کی وسعت نے بہت سی نئی ضرورتیں پیدا کردی تھیں جن کے احکام کے متعلق ان کو مجبوراً تحقیقات کرنی پڑتی تھی اور اس حالت میں صحابہؓ اور ان کے شرکائے فتویٰ یعنی کبار تابعینؒ کے سوا کوئی دوسرا ٹھکانا نہ تھا اس لئے ان حدیثوں کے ذریعہ سے جو ان کو یاد تھیں ان کو فتویٰ دینا پڑتا تھا۔ لیکن ان میں بعض حدیثوں کو تو انھوں نے براہ راست رسول اللہ صلعم سے سنا تھا اور بعض حدیثیں کبار صحابہ سے سنی تھیں۔ اس دور کے اصحاب فتویٰ سے حدیثوں کی ایک بہت بڑی تعداد روایت کی جاتی ہے چنانچہ ان میں بعض مفتیوں کی حدیثیں ہزاروں سے زیادہ ہیں مثلاً مسند احمد بن حنبل میں مسند ابی ہریرہؓ ۳۱۳ صفحوں میں اور مسند عبداللہ بن عمرؓ ۱۵۶ صفحوں میں لکھا ہوا ہے اور اسی کے قریب اس دور کے اور صغار صحابہؓ کا حال ہے۔ حالانکہ مسند ابی بکرؓ ۱۳ صفحوں میں لکھا ہوا ہے اور حضرت عمرؓ جو دور اول کے امام المفتیین تھے ان کا مسند ۴۱ صفحوں میں درج ہے۔ اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی فتوے میں ان کے ہم پایہ تھے لیکن ان کا مسند صرف ۸۵ صفحوں میں آیا ہے۔ لیکن کسی ایک شہر بلکہ کسی ایک کتاب میں یہ تمام حدیثیں مجموعی طور پر نہیں پائی جاتی تھیں کیونکہ جو صحابہ فتویٰ دینے والے تھے وہ جیسا کہ ہم ابھی لکھ چکے ہیں مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اسلئے جو بزرگ جس شہر میں آئے اس کے باشندوں نے ان سے روایت کی اور اس لئے ایک شہر میں جن حدیثوں کی روایت کی گئی وہ دوسرے شہر والوں کو نہ مل سکی۔ مثلاً مدینہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ ام المومنین حضرت عائشہؓ اور حضرت ابوہریرہؓ رہتے تھے۔ مکہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قیام تھا فسطاط میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ رہتے تھے۔ بصرہ میں حضرت انس بن مالکؓ اور کوفہ میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے تلامذہ سکونت پذیر تھے اور ان میں سے ہر ایک کے پاس احادیث نبویہ کا جو ذخیرہ تھا وہ انہی کے مطابق لوگوں کو فتویٰ دیتا تھا۔ اور اس موقعہ پر مختلف

شہروں کے علماء کے درمیان علمی تعلقات کے قائم رکھنے میں گذشتہ سب سے زیادہ وضاحت کے ساتھ خانہ کعبہ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے غرضکہ ان تینوں خصوصیات نے فتویٰ میں بہت سے اختلافات پیدا کردیئے اور ان میں ہر ایک خصوصیت اختلاف کے پیدا کرنے کا قوی سبب بن گئی۔ مثلاً ان خصوصیات نے شیعوں کے لئے الگ، خوارج کے لئے الگ اور تمام امت کیلئے الگ الگ فتاوے پیدا کردیئے جو باہم ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

آپ نے غور کیا کہ اس بند میں جسے نبی اکرم صلعم نے لگایا تھا اور جسے بعد میں حضرات شیخینؓ کے ہاتھوں نے تقویت دی تھی ذرا سا سوراخ ہو جانے سے پانی نے کس طرح رفتہ رفتہ سیلاب کی شکل اختیار کرلی۔ اب ہوا یہ کہ مملکت کے مختلف شہروں میں انفرادی مراکز قائم ہوگئے۔ لوگ اپنے معاملات کے لئے نمائندگان حکومت کی طرف رجوع کرنے کے بجائے ان حضرات سے فتوے طلب کرنے لگے۔ اس مقصد کیلئے انھیں احادیث کی ضرورت لاحق ہوئی اور چونکہ احادیث کے روایت کرنے پر بھی حکومت کی طرف سے کوئی پابندی نہیں رہی تھی اس لئے اب جگہ بجگہ روایات کے دفتر کھل گئے اور اس کے ساتھ ہی جھوٹی حدیثیں بھی وضع ہونی شروع ہوگئیں چنانچہ اس باب میں علامہ محمد الخضریؒ (اس جھوٹ کی روایت کے اسباب وعلل گنانے کے بعد) لکھتے ہیں:-

"تعلیم یافتہ غلاموں کی ایک بہت بڑی تعداد پیدا ہوگئی چنانچہ بہت سے ایرانی، رومی اور مصری لوگ حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے جو موالی کے لقب سے مشہور تھے کیونکہ جو شخص جس شخص کے ہاتھ پر اسلام لاتا تھا وہ اس کا مولیٰ ہوتا تھا۔ ان میں بعض لوگ تو ایسے تھے جو غلام بنائے گئے تھے اور بعض لوگ غلام بنانے سے پہلے ہی مسلمان ہوگئے تھے مسلمانوں نے بہت سے لڑکوں کو بھی گرفتار کیا ان کو اپنے زیر تربیت رکھا اور ان کو قرآن وحدیث کی تعلیم دی چنانچہ ان لوگوں نے قرآن وحدیث کو یاد کیا، ان کو سمجھا اور اس معاملہ میں ان کو لکھنے پڑھنے کی جو استعداد حاصل تھی اس سے کام لیا، اسوقت عام عربی اسلامی جماعت میں اگرچہ سخت قومی تعصب موجود تھا بایں ہمہ انھوں نے مجبوراً ان کی عزت کی اور ان کے فتووں اور روایتوں کو تسلیم کیا۔ یہ لوگ تمام اسلامی شہروں میں موجود اور علم اور تعلیم میں صحابہ اور عرب کے کبار تابعین کے شریک تھے چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ کے ساتھ ان کے راوی اور مولیٰ عکرمہؓ کا اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ ان کے مولیٰ نافعؓ کا اور حضرت انس بن مالکؓ کے ساتھ ان کے مولیٰ محمد بن سیرینؒ کا اور حضرت ابوہریرہؓ کے ساتھ ان کے راوی عبدالرحمٰن بن ہرمز اعرج کا ذکر اکثر کیا جاتا ہے۔ اور صحابہ میں یہی چاروں بزرگ ہیں جن سے اکثر حدیثیں اور فتوے منقول ہیں اور ان کے چار موالی کو اس حیثیت سے بڑی عزت حاصل ہے۔ اگرچہ[1] یہ خیال غلط ہے کہ فقہ اور روایت میں عرب کا حصہ عجمیوں سے کم ہے بلکہ اس معاملہ میں دونوں برابر کے شریک تھے چنانچہ کوئی شہر ایسا نہ تھا جس میں دونوں

---

[1] علامۂ موصوف کا یہ اعتذار محل نظر ہے جبکہ وہ خود تسلیم فرما چکے ہیں کہ صحابہ میں یہی چاروں بزرگ ہیں جن سے اکثر حدیثیں اور فتوے منقول ہیں اور ان صحابہؓ کے ساتھ اکثر ان کے ان چاروں موالی ہی کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اگر احادیث کے ذخائر کا جائزہ لیا جائے تو اہل عجم کے مقابلہ میں اہل عرب کی احادیث ۱/۲ بھی نہیں نکلتیں (طلوع اسلام)

عربی کی وافر تعداد موجود نہ ہو تاہم بعض شہر مثلاً بصرہ میں موالی کو امتیاز حاصل تھا اور حسن بن الحسن البصریؒ ان کے سردار تھے اور بعض شہر مثلاً کوفہ میں فقہائے عرب نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ (تاریخ فقہ اسلامی صفحہ ۱۹۷ - ۱۹۹ و صفحہ ۲۰۵ و ۲۰۶)

تصریحات بالا سے آپ نے دیکھا کہ اس قسم کی مسندیں کس طرح ہر ہر بستی اور ہر ہر شہر میں بچھائی جا چکی تھیں۔ ان بستیوں اور شہروں کے محدثین کا اعتماد بالعموم ان ہی روایات پر ہوتا تھا جو ان کی بستیوں اور شہروں میں بسنے والے صحابہ سے ان کو پہنچی تھیں۔ ذرائع نقل و حمل کی سہولتیں چونکہ حاصل نہیں تھیں اسلئے عموماً ان محدثین کو ان دوسری حدیثوں کی خبر نہیں ہوتی تھی جو دوسرے شہر کے لوگوں کے پاس موجود ہوتی تھیں اور اگر حج وغیرہ کے موقعہ پر علم بھی ہو جاتا تھا تو ایسا بہت ہی کم ہوتا تھا کہ ایک خیال کے محدثین نے دوسرے خیال کے محدثین سے اتفاق کر لیا ہو اور اپنے فیصلوں سے رجوع کر لیا ہو البتہ اس طرح بحث و مباحثہ اور طعن و تشنیع کا دروازہ ضرور کھل جاتا تھا۔ اختلافات کی یہ گرم بازاری اسقدر بڑھی کہ سینکڑوں مذاہب پیدا ہو گئے۔ نہ صرف ہر ہر قریہ اور ہر ہر شہر کا مذہب ایک دوسرے سے الگ تھا بلکہ بااوقات ایک ہی شہر میں مختلف گروہوں کے مذاہب مختلف تھے۔

یہ حضرات تو انتقال فرما گئے مگر اپنے پیچھے تابعین کی ایک فوج چھوڑ گئے جو آگے چل کر اپنے اپنے علاقہ کے مستقل امام کہلائے تابعین ہی کے دور سے روایات پر عجمیت نے غلبہ حاصل کرنا شروع کر دیا تھا جو آگے چل کر مکمل عجمی اقتدار کی صورت میں نمودار ہوا۔ یہ حضرات تابعین بھی خدا کو پیارے ہوئے تو اس سے کہیں بڑی فوج تبع تابعین کی موجود تھی اور پھر ان کے بعد ان کے شاگردان رشید اور پھر ان شاگردانِ رشید کے شاگران رشید وقس علیٰ ہذا۔ ان میں سے ہر شخص ایک مستقل امام تھا اور ہر امام کے پیچھے سو ہزار لاکھ دس لاکھ آدمیوں کی ٹولی ہوتی تھی۔ ہر ٹولی ایک مختلف مذہب کی پیرو کار تھی جن میں بااوقات جھگڑے فضیحتے اور جنگ و جدل تک کی نوبت آجاتی تھی۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ دینی اقتدار کس طرح مرکز ملت کے ہاتھ سے نکلکر افراد و اشخاص کے ہاتھوں میں پہنچا اور پھر خواب پریشاں کی طرح اس کا شیرازہ کس طرح منتشر ہوا۔

اس کے بعد حالات نے ایک اور پلٹا کھایا۔ تمدنی ضروریات چونکہ دن بدن بڑھتی چلی جا رہی تھیں اور آئے دن نت نئے مسائل کا سامنا تھا جن میں روایات کا ذخیرہ راہنمائی نہیں کر سکتا تھا اسلئے ان علماء کو بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ روایت پرست حضرات کا مسلک یہ تھا کہ دین میں عقل کو کوئی دخل نہیں۔ ہر مسئلہ کا فیصلہ روایت ہی سے ہو سکے گا خواہ وہ روایت ضعیف اور موضوع ہی کیوں نہ ہو چنانچہ یہ حضرات اصحاب الظاہر کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں مگر ان کے مقابلہ میں علماء کا ایک دوسرا گروہ پیدا ہوا جنھوں نے کہا کہ وہ اپنی عقل و بصیرت سے کام لیکر ان مسائل کا حل دریافت کرینگے۔ ان عقل و بصیرت سے کام لینے والوں میں بھی دو قسم کے گروہ تھے۔ ایک وہ جو اپنی عقل و بصیرت کو زیادہ وزن دیتے تھے اور روایات کی زیادہ پروا نہیں کرتے تھے اور دوسرے وہ جو روایات کو سامنے رکھکر اسی کے دائرہ میں رہتے ہوئے غور و فکر کرتے تھے۔ یہ علماء اصحاب الفقہ کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں جن میں سے اول الذکر قسم کے علماء کو خصوصیت کے ساتھ اصحاب الرائے بھی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ مذہبی اقتدار اب تین طبقوں میں تقسیم ہو گیا۔

(۱) محدثین اصحاب الظاہر

(۲) محدثین فقہاء

(۳) اصحاب الرائے فقہاء

اس سے مزید انتشار پھیلا۔ خلافت ملوکیت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ان بادشاہوں کو اپنے عیش وعشرت سے اتنی فرصت ہی نہیں تھی کہ وہ ملت کے اس انتشار پر غور کرتے اور اس کا کوئی علاج سوچتے۔ پھر ویسے بھی اموی حکومت، اپنی داخلی کمزوریوں کی وجہ سے ان مسائل پر غور کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔ مرکز کے اضمحلال کے ساتھ ساتھ یہ دینی انتشار دن بدن بڑھتا ہی رہا تا آنکہ اموی حکومت کا خاتمہ ہو کر سیاسی اقتدار عباسیوں کے ہاتھ میں آگیا۔ یہ بھی بادشاہ ہی تھے اور انھیں بھی ملت کی اجتماعیت اور مرکزیت جیسے مسائل سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی لیکن مذہبی افتراق و انتشار چونکہ بسا اوقات بدنظمی اور لڑائی جھگڑوں تک منتج ہو جاتا تھا اس لئے انتظامی مصلحت سے انھوں نے اس انتشار کو کم کرنا چاہا۔ ان کا پایہ تخت چونکہ بغداد (عراق) تھا اور عراق میں مذہب حنفی کو غلبہ اور اکثریت حاصل تھی اس لئے انھوں نے امام اعظم ابوحنیفہؒ کے شاگرد رشید امام ابو یوسف کو قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کر کے عملاً حنفی مذہب کو حکومت کا مذہب قرار دیدیا۔ یعنی اس طرح افراد کے بنائے ہوئے قانون کو حکومت کی سند بھی حاصل ہو گئی۔

غور فرمایا آپ نے کہ حالات نے کیا پلٹا کھایا۔ حضرات شیخینؓ کے عہد میں حکومت خود قانون بناتی تھی اور افراد اس قانون کا اتباع کرتے تھے اور اسی قانون کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت کہلاتی تھی۔ مگر اب اس دور ملوکیت میں حکومت قانون نہیں بناتی بلکہ قانون تو افراد بناتے ہیں اور حکومت اس قانون کو اپنا لیتی ہے۔ پہلے اقتدار بالکلیہ مرکز کے ہاتھ میں ہوتا تھا اور اب ان افراد و اشخاص کے ہاتھ میں تبدیل ہو گیا۔ عباسی حکومت نے دوسرے مذاہب کو اگرچہ قانوناً ممنوع اور ناجائز قرار نہیں دیا مگر مذہب حنفی نے سرکاری سرپرستی کی بنا پر اتنی قبولیت عامہ حاصل کر لی کہ دوسرے مذاہب کی مخالفت میں وہ شدت باقی نہیں رہی جو آئے دن خونریز فتنوں اور لڑائی جھگڑوں کا باعث بنتی تھی۔ اس طرح ماضی کے انتشار و افتراق کا کسی قدر سدباب ضرور ہو گیا۔

مگر یہ صورت زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہی۔ دور ملوکیت کے فیصلے عقل و بصیرت سے زیادہ بادشاہوں کی سیاسی مصلحتوں کے مطابق ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ ہارون الرشید کے دور میں اگر سیاسی مصالح اس کی مقتضی تھیں کہ مذہب حنفی کو حکومت کا مذہب قرار دیا جائے اور مامون الرشید کے عہد میں محدثین کو سخت ابتلاء و آزمائش کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ تو متوکل باللہ کے عہد میں شاہی مصالح اس کی مقتضی ہو گئیں کہ محدثین (اہل الظاہر) کے مذہب کو اپنا لیا جائے۔ چنانچہ اس انقلاب معکوس نے مذہب حنفی کے پیروکاروں پر مصائب و آلام کے وہ پہاڑ توڑے کہ علمائے حنفیہ اپنے مذہب کا رشتہ ہی ہاتھ سے کھو بیٹھے اور عملاً محدثین ہی کے رنگ میں رنگے گئے۔

یہ انقلابات آتے رہے۔ کبھی حکومت کا مذہب اہل الرائے (حنفی فقہاء) کا مذہب بنا اور کبھی محدثین (اصحاب الظاہر یا فقہائے محدثین) کا مذہب۔ مگر جس دور میں حکومت کا جو مذہب ہوا عامۃ المسلمین اس پر گامزن ہو گئے اور دوسرے مذاہب کو طاقت کے

زور سے دبا دیا گیا۔ بہرحال یک گونہ یکسانیت باقی رہی۔ مگر یہ بھی اسی وقت تک رہ سکا جب تک حکومت عباسیہ سیاسی حیثیت سے طاقتور رہی۔ لیکن جوں جوں اس میں سیاسی اضمحلال کے آثار نمایاں ہونے شروع ہوئے، انتشار و افتراق نے پھر سر نکالنا شروع کر دیا تاآنکہ مسلمان دین کی مرکزیت سے محروم ہو جانے کے بعد سیاست کی مرکزیت سے بھی محروم ہو گیا اور حکومت عباسیہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ اس سیاسی مرکزیت سے محروم ہو جانے کے بعد ملت کے پاس طاقت کا وہ رشتہ بھی نہ رہا جو زبردستی ان منتشر دانوں کو کسی ایک لڑی میں منسلک رکھتا تھا۔ اس کے بعد پھر فتنہ و فساد اور سب و شتم بلکہ جنگ و جدال کی نوبت پیش آنے لگی جو بلحاظ نتائج ماضی کی آویزشوں سے زیادہ ہولناک تھی۔ بالآخر اس انتشار و افتراق کے نتائج سے مجبور ہو کر علما کو سوچنا پڑا کہ آخر اس کا علاج کیا جائے۔ بڑے غور و فکر اور سوچ بچار کے بعد علمائے محدثین نے یہ اعلان کر دیا کہ جتنی حدیثیں بیان کی جانی تھیں وہ بیان ہو چکیں آئندہ کسی کو نئی حدیثیں بیان کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ حدیث کی فلاں فلاں کتابیں مستند مانی جائیں گی اور فلاں فلاں غیر مستند۔ دوسری طرف فقہاء نے یہ اعلان کر دیا کہ آئندہ سے کسی کو اجتہاد کرنے کا حق نہیں ہوگا۔ جتنا اجتہاد ہونا تھا وہ ہو چکا اور ماضی کے مجتہدین اگرچہ سب کے سب برحق ہیں اور ان کی فقہ اگرچہ صحیح ہے لیکن آئندہ کے لئے صرف چار فقہیں مستند مانی جائیں گی۔ حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی۔ گویا عقل و بصیرت کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند کر دیئے گئے۔

چنانچہ آج ہمارے علمائے کرام کے پاس کوئی فتویٰ دریافت کرنے جائیے تو اگر وہ محدثین میں سے ہیں تو وہ آپ کو یہ بتا دینگے کہ اس بارہ میں فلاں محدث نے اپنی فلاں کتاب میں یہ حدیث لکھی ہے، اور اگر وہ فقہاء میں سے ہیں تو وہ آپ کو یہ بتا دینگے کہ فلاں امام نے اس مسئلہ کے متعلق اپنی فلاں کتاب میں یہ لکھا ہے اور بس۔

آپ نے غور فرمایا کہ مرکز کے ہاتھ سے دین کا اقتدار نکل جانے کے بعد دین کا کیا حشر بنا اور وہ کس طرح بازیچۂ اطفال بن گیا۔

بہرحال یہ ہے تاریخ کی روشنی میں مسلمانوں کے اندر ملاازم کی ابتدا اور اس کی ترقی کی داستان۔ طلوع اسلام کی دعوت یہ ہے کہ ملت کو چاہیئے کہ وہ اپنے معاشرہ کو پھر سے انہی بنیادوں پر قائم کرے جن پر رسول اللہ صلعم نے اس کو قائم کیا تھا تاکہ ملت اپنی اجتماعی مرکزیت کی برکت سے پھر مستفیض ہو سکے مگر ملا کی دعوت یہ ہے کہ اجتماعی مرکزیت کی کوئی ضرورت نہیں۔ ملت کو دین کے متعلق جو کچھ پوچھنا ہو ہم سے پوچھے۔ ہمارا دیا ہوا فتویٰ شریعت کا فیصلہ قرار پائے گا۔ اگر پاکستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی ہے تو بھی ہماری اس پوزیشن میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ملت کے نمائندوں کی مجلس آئین ساز از خود شریعت کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اسے ہر معاملہ میں استصواب کرنا ہوگا۔ اور وہی قانون شرعی کہلا سکے گا جسے ہماری سند حاصل ہوگی۔

تاریخی حقائق آپ کے سامنے آچکے ہیں ان سے جو نتائج مستنبط ہوتے ہیں وہ بھی آپ کے سامنے ہیں۔ اب آپ خود ہی فیصلہ فرمائیے کہ نجات و فلاح کا راستہ وہ ہو سکتا ہے جو رسول اللہ صلعم کا راستہ تھا یا وہ راستہ ہو سکتا ہے جو اس عہد برکت عہد کے بعد زمانہ ہنگامہ و فتن کی پیداوار ہے؟۔

آخر میں ضمناً ایک اور حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرانا ضروری نظر آتا ہے. جب ہم کہتے ہیں کہ اسلام میں ملائیت کا تصور یکسر غیر اسلامی ہے تو ملاؤں کی طرف سے جواب دیا جاتا ہے کہ علمار کا گروہ برہمنوں کی طرح نہیں جو یہ کہتے ہوں کہ شریعت کا علم ان کے ہاں خاندانی طور پر، باپ سے بیٹے کی طرف منتقل ہوتا ہے اور اس گروہ میں باہر کا کوئی آدمی داخل نہیں ہوسکتا۔ دین کا علم ہر ایک کے لئے کھلا ہے. جس کا جی چاہے اسے حاصل کرلے اور علما کے گروہ میں شامل ہوجائے۔ لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ علمار کا گروہ برہمنوں کا گروہ ہے۔ یہ حضرات اتنا کہہ کر سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے معترضین کے اعتراض کا مسکت جواب دیدیا ہے اور نہیں سمجھتے کہ یہ جواب ابلہ فریبی نہیں بلکہ خود فریبی ہے. ہم نے شروع میں ملا ازم کی جو تصریح کی ہے اس سے ظاہر ہے کہ پیشوائیت یا ملائیت کے یہ معنی نہیں کہ شریعت کا علم کسی ایک گروہ میں باپ سے بیٹے کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ ملائیت کے معنی یہ ہیں کہ دین کے احکام کے لئے نظام اسلامی کے مرکز کی طرف رجوع کرنے کی بجائے افراد کی طرف رجوع کیا جائے۔ اور یہ حق نمائندگانِ ملت کو نہ دیا جائے بلکہ دوسرے افراد کو دیا جائے کہ وہ ملت کے لئے شریعت کا قانون مرتب کریں۔ یہ ہے پیشوائیت یا ملائیت۔ پیشوائیت کی ایک شکل وہ ہے جسے برہمنوں نے اختیار کر رکھا ہے اور جس میں مذہب کا علم اس فرقہ میں باپ سے بیٹے کی طرف منتقل ہوتا ہے لیکن پیشوائیت کی دوسری شکل وہ ہے جو عیسائیوں میں رائج ہے۔ وہاں پیشوائیت، نسلاً آگے منتقل نہیں ہوتی جو کوئی شریعت کا علم حاصل کرلے وہ پادری بن سکتا ہے۔ چونکہ مسلمانوں میں پیشوائیت، اولاً عیسائیت کے راستے آئی تھی اسلئے ان کے ہاں پیشوائیت کی وہی شکل رائج رہی جو عیسائیوں کے ہاں رائج تھی۔ برہمنوں کی سی پیشوائیت نہ اُن کے ہاں تھی نہ ان (مسلمانوں) کے ہاں آئی۔ لہٰذا اس بات سے کہ ملائیت نسلاً آگے نہیں چلتی۔ ملا کی پیشوائیت پر تو کچھ اثر نہیں پڑتا۔ پیشوائیت، بہرحال پیشوائیت ہے، خواہ وہ عیسائیوں کے انداز کی ہو خواہ ہندو برہمنوں کے شکل کی۔ برہمنیت میں پیشوائیت اور نسل پرستی دونوں شامل ہیں. عیسائیت اور مسلمانوں کی ملائیت میں صرف پیشوائیت ہے، نسل پرستی نہیں۔

لہٰذا ملائیت خالص پیشوائیت ہے جو قرآن کے بھی خلاف ہے اور سنت رسول اللہ کے بھی خلاف۔ اس کا مٹانا طلوعِ اسلام کی جدوجہد کا مقصد ہے۔ واللہ المستعان۔

نوادرات

مجموعۂ مضامین علامہ اسلم جیراجپوری

بڑا سائز | ضخامت ۔۔۴ صفحات | قیمت چار روپے | محصولڈاک نو آنے

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ کوی روڈ۔ نزد پیراڈائز سینما۔ کراچی

نقد و نظر

(چوھدری محمد ظفر اللہ خاں صاحب توجہ فرمائیں)

ایک عزیز کے نام خط تصنیف۔ چوھدری محمد ظفر اللہ خاں صاحب۔ شائع کردہ تالیف و اشاعت قادیان۔ ضخامت ۱۶۹ صفحات۔ قیمت فی نسخہ ۶؍ آنے۔

یہ خیال اکثر دھرایا جاتا ہے (اور ہم سے بھی اس کے متعلق اکثر پوچھا جاتا ہے) کہ احمدی (میرزائی) جماعت میں ایسے ایسے لکھے پڑھے لوگ موجود ہیں۔ اگر یہ سلسلہ ایسا ہی خلاف اسلام اور باطل پر مبنی ہے تو اس قدر تعلیم یافتہ اور سمجھدار لوگ اس میں کیوں شامل ہیں؟ اس "تعلیم یافتہ سمجھدار طبقہ" میں چوھدری محمد ظفر اللہ خاں صاحب کا نام خصوصیت سے لیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ کیا چوھدری صاحب جیسے بین الاقوامی شہرت رکھنے والے انسان کی سمجھ میں بھی یہ بات نہیں آسکی کہ "احمدیت" باطل کا مسلک ہے؟

اس سوال کا ایک جواب تو بالکل صاف ہے کہ اگر کسی کے تعلیم یافتہ اور سمجھدار ہونے سے یہ لازم آجاتا ہے کہ وہ مذہب کے حقائق کو بھی پرکھ سکے اور کسی کی بین الاقوامی شہرت اس کی ضمانت ہو سکتی ہے کہ وہ حق و باطل میں بھی تمیز کر سکے تو مہاتما گاندھی کو کبھی ہندو دھرم جیسے فرسودہ مذہب کا پیرو نہیں ہونا چاہیئے تھا اور پنڈت جواہر لال نہرو کو کبھی خدا کا منکر نہیں ہونا چاہیئے! اس سے بھی آگے بڑھئے تو چرچل کو کبھی عیسائیت جیسے اوہام پرست مذہب کا پیرو اور اسٹالن کو کھلا ہوا ملحد نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ ان سب کو اسلام کا پیرو ہونا چاہیئے تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ انھیں اسلام کے مطالعہ کا موقع نہیں ملا اسلئے یہ اسے قبول نہیں کر سکے۔ لیکن ان ہزارہا مستشرقین کے متعلق آپ کیا کہیں گے جنھوں نے اپنی ساری عمر اسلام کے مطالعہ میں صرف کر دی اور غیر مسلم جئے اور غیر مسلم ہی مرے! اسلام کو بھی چھوڑیئے۔ اس بات کے سمجھنے کیلئے کونسی افلاطون کی عقل کی ضرورت ہے کہ گائے ایک جانور ہے باقی جانوروں جیسا جانور۔ اور پتھر کی مورتی خود انسانوں کی بنائی ہوئی، بے جان اور بے مقدرت مورتی ہوتی ہے۔ لیکن گاندھی جیسے بین الاقوامی شہرت کے سمجھدار لیڈر اور رادھا کرشن جیسے بین الاقوامی شہرت کے فلاسفر گائے اور مورتیوں کی پرستش کرتے تھے اور کرتے چلے جاتے ہیں! ذرا سوچئے کہ ان کا علم اور ان کی عقل جو دوسرے شعبوں میں انھیں ایسی ایسی باریک باتیں سمجھا دیتے ہیں، انھیں اتنی سی بات بھی نہیں بتا سکتے کہ انسان کو جانوروں اور پتھر کی مورتیوں کے سامنے نہیں جھکنا چاہیئے؟ لہذا یہ تو کوئی دلیل نہیں کہ فلاں شخص تعلیم یافتہ ہے اور بین الاقوامی شہرت کا مالک، اس لئے وہ جس مذہب و مسلک کا پیرو ہے اسے بھی لازماً سچا ہونا چاہیئے۔ کوئی شخص تعلیم یافتہ ہو یا غیر تعلیم یافتہ۔ بین الاقوامی شہرت کا حامل ہو یا مجہول الحال۔ دیکھنے کی بات یہ ہوگی کہ جو کچھ وہ مانتا اور کہتا ہے اس کے

پاس اس کی دلیل اور سند کیا ہے۔ اگر اس کی دلیل محکم اور اس کی سند معتبر ہے تو اس کا دعویٰ اور مسلک برحق ہے (خواہ وہ مجہول الحال اور غیر تعلیم یافتہ ہی کیوں نہ ہو)۔ لیکن اگر اس کی دلیل کمزور اور سند غیر معتبر ہے تو اس کا دعویٰ باطل اور مسلک گمراہ کن ہے (خواہ وہ کتنا ہی تعلیم یافتہ اور بین الاقوامی شہرت کا مالک کیوں نہ ہو)۔

جب ہم سے چوھدری محمد ظفر اللہ خاں صاحب کے متعلق خصوصیت سے پوچھا جاتا تو ہم جواب میں کہتے کہ خود یہ حقیقت کہ چوھدری صاحب "احمدیت" جیسے کمزور مسلک کے متبع ہیں، اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ قرآن کے متعلق ان کا علم بھی (زیادہ سے زیادہ) ویسا اور اتنا ہی ہے جیسا اور جتنا علم خود میرزا صاحب کا تھا۔ ہم اس سے زیادہ کچھ اور اس لئے نہیں کہہ سکتے تھے کہ ان کے عقیدے اور مسلک کے متعلق خود چوھدری صاحب کی کوئی تحریر ہمارے سامنے نہ تھی جس سے ہم ان کے قرآنی علم کا جائزہ لیکر بتا سکتے کہ اس کی وسعت اور گہرائی کہاں تک ہے۔ زیر نظر پمفلٹ کو ہم نے اسی لئے بڑی دلچسپی سے پڑھا ہے اور اب اس پر ذرا تفصیل سے تبصرہ کر رہے ہیں کہ اس میں چوھدری صاحب نے اپنے مسلک کے متعلق خود اپنے قلم سے لکھا ہے۔

یہ پمفلٹ ایک خط پر مشتمل ہے جسے چوھدری صاحب نے (۱۹۳۹ء میں) اپنے کسی عزیز کے نام لکھا تھا۔ اس کا بیشتر حصہ اسلام کی عمومی تعلیم سے متعلق ہے اور "احمدیت" کے متعلق جستہ جستہ مقامات پر سرسری سا ذکر آگیا ہے۔ جہاں تک اسلام کی عمومی تعلیم کا تعلق ہے اس میں نہ کوئی وسعت ہے نہ گہرائی۔ وہی "مولویانہ اسلام" جسے عام طور پر وعظوں میں دہرایا جاتا ہے۔ مثلاً "اللہ تعالیٰ مالک یوم الدین ہے . . . . جرم پر چاہے تو مناسب سزا دے اور چاہے تو بخش دے۔ وہ پابند نہیں کہ جرم کی ضرور سزا دے یا پوری سزا دے" (۲۸)۔ "وہ اپنے فرمانبردار اور مسکین اور فروتن بندوں کے ساتھ بڑھ چڑھ کر سلوک کرتا ہے" (ص ۲۹)۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص (اور کوئی گروہ) علم و عقل اور فکر و نظر میں اس شخص سے اونچا نہیں جا سکتا جسے اس نے اپنا مذہبی پیشوا تسلیم کر لیا ہو۔ اس کے نزدیک اس سے اونچا جانا تو ایک طرف، اس کے ہمدوش چلنے کا تصور بھی اسے مرتد اور راندۂ درگاہ بنا دیتا ہے حتیٰ کہ (ادراکِ حقائق تو ایک طرف) وہ اسلوبِ نگارش اور اندازِ بیان میں بھی اپنے پیشوا سے بہتر ہونے کا تصور نہیں کر سکتا۔ [یہی وجہ ہے کہ آپ کو میرزائی لٹریچر میں حسنِ ذوق اور لطافتِ خیال کا شائبہ تک نظر نہیں آئے گا۔ حتیٰ کہ شعر کے انتخاب میں بھی ان کا معیار میرزا صاحب کے ذوق اور معیار سے بلند نہیں ہوگا۔ چنانچہ خود چوھدری صاحب بھی اپنے خط میں اگر کہیں کوئی شعر نقل کرتے ہیں تو اس قسم کا کہ

عادتِ ذکر بھی ڈالو کہ یہ ممکن ہی نہیں — دل میں ہو عشقِ صنم لب پہ مگر نام نہ ہو

یہ شعر، جیسا کہ خود شعر پکار رہا ہے، حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کا ہے]

لہٰذا اسلام کی عمومی تعلیم کے متعلق جو کچھ چوھدری صاحب نے لکھا ہے، اس سے صرفِ نظر کر کے، ہم صرف اس حصے سے بحث کریں گے جس کا تعلق ان کے مسلکِ "احمدیت" سے ہے۔ اس ضمن میں ایک بنیادی چیز قابلِ ذکر ہے اور وہ یہ کہ ہمارے نزدیک اسلام کی بنیاد ان عقائد و تصوراتِ حیات پر ہے جو قرآن کریم میں مندرج ہیں۔ اسلئے کسی عقیدے یا تصور کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار بھی قرآن ہی ہے۔ زیر نظر پمفلٹ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خود چوھدری صاحب بھی اس حقیقت سے متفق ہیں۔ اسلئے دیکھنا یہ ہے

کہ جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اس کی سند اور دلیل قرآن کریم سے ملتی ہے یا نہیں۔

چوہدری صاحب نے وحی کے متعلق ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> انسان پر اللہ تعالیٰ کی مرضی کا اظہار کرنے کے کئی طریق ہیں۔ ان میں سے ابتدائی طریق رؤیا ئے صادقہ کا ہے . . . . پھر کشوف کا درجہ ہے . . . . اور کشف سے بڑھ کر پھر خالص الہام اور وحی کا سلسلہ ہے . . . . لیکن جو نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ خالص الہام یا وحی کے الفاظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں۔ اور وہ کلام اللہ تعالیٰ کا کلام ہوتا ہے۔ (صفحہ ۴۷-۴۶)

کیا چوہدری صاحب بتا سکتے ہیں کہ قرآن میں کہیں یہ لکھا ہے کہ الہام کے الفاظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں؟ کیا سارے قرآن میں کسی ایک جگہ بھی کسی نبی کے لئے الہام کا ذکر آیا ہے؟

کشف اور الہام کا تصور عجمی تصوف کا پیدا کردہ ہے جسے قرآن سے کوئی تعلق نہیں۔ قرآن "خدا کی مرضی کے اظہار" کے لئے (جسے قوانینِ خداوندی کہنا چاہئے) صرف وحی کا ذریعہ بتاتا ہے۔ اور یہ وحی صرف انبیاء کو ملتی ہے۔ اور یہ سلسلہ وحی نبی اکرمؐ پر ختم ہو چکا ہے (جو اب قرآن کے اندر محفوظ ہے)۔ میرزا صاحب نے الہام کا تصور تصوف کے لٹریچر سے لیا اور اسے وحی کے ساتھ مخلوط کر کے الہام اور وحی کو ایک ہی حقیقت سمجھ بیٹھے۔ اسی کو چوہدری صاحب نے دہرا دیا ہے۔ بہرحال، یہ ان کے ذمے ہے کہ اس کی سند قرآن سے پیش کریں۔

اب آیئے چوہدری صاحب کے مرکزی خیال (یعنی نبوتِ میرزا صاحب) کی طرف۔ اس ضمن میں چوہدری صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

> مسلمانوں کی طرف سے بڑا اعتراض جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے دعویٰ پر کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی نہیں آسکتا اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ یہ ایک لمبا مسئلہ ہے لیکن مختصر طور پر ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ قرآن کریم آخری شریعت ہے اور چونکہ یہ ہر رنگ میں کامل ہے اس لئے اس کے بعد کسی نئی شریعت کی ضرورت نہیں اور نہ کوئی نیا شارع نبی آسکتا ہے جو اسلامی شریعت کو منسوخ کرے یا اس کی ترمیم کرے اور نہ کوئی ایسا نبی آسکتا ہے جس کو بغیر اتباع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کا درجہ عطا ہو کیونکہ بجز آپ کی اتباع کے اور قرآن کریم پر عمل کرنے کے کوئی شخص مومن نہیں بن سکتا چہ جائیکہ اعلیٰ ترین روحانی انعام یعنی درجۂ نبوت کو پا سکے لیکن اس رنگ میں نبی آسکتا ہے کہ وہ اتباع نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں فنافی الرسول کا مقام حاصل کر لے اور اللہ تعالیٰ اسے کثرت مکالمہ مخاطبہ سے مشرف فرمائے اور اسے تجدید اسلام کے لئے مقرر فرمائے اور اسے نبوت کا درجہ عطا فرمائے کیونکہ ایسی نبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ہی ظلی اور جزو ہے اور حضورؐ کی نبوت سے الگ نہیں اور ایسی نبوت امتِ محمدیہ کے لئے ایک رحمت ہے اور ختم نبوت کے منافی نہیں اور امتِ محمدیہ کو دوسری امتوں سے ممتاز کرتی ہے۔ کیونکہ ان کی تعلیمیں

اور شریعتیں منسوخ ہوچکی ہیں اوران کی تجدید و احیاء کے لئے اب کسی خاص انتظام کی ضرورت نہیں۔ لیکن قرآن کریم زندہ ہے اور منسوخ نہیں ہوسکتا اوراس کی باطنی حفاظت کے لئے اوراس کی تعلیم کے مطابق نمونہ قائم کرنے کیلئے ضرورت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے احیاء کا انتظام ہو سو وہ ظلی نبوت کا سلسلہ ہے جو اس امت میں جاری ہے۔ (ص۸۵-۸۴)

اس اقتباس سے واضح ہے کہ چوھدری صاحب کی تصریحات کے مطابق۔

(۱) میرزا صاحبؒ مسیح موعودؑ ہیں۔

(۲) انھوں نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔

(۳) قرآن کے بعد کسی نئی شریعت کی ضرورت نہیں۔ نہ ہی کوئی نیا شارع نبی آسکتا ہے۔ البتہ ایسا نبی آسکتا ہے جو شارع نہ ہو۔

(۴) اور جسے اتباع نبی کریم سے نبوت کا درجہ عطا ہوجائے۔

(۵) اس کی یہ نبوت، رسول اللہؐ ہی کی نبوت کا ظل اور جزو ہے۔

(۶) خدا نے قرآن کی باطنی حفاظت کیلئے ظلی نبوت کا سلسلہ امت میں جاری رکھا ہے۔

ان نکات کو ایک ایک کرکے لیجئے۔

(۱) "مسیح موعود" سے یہ واضح ہے کہ چوھدری صاحب کے نزدیک امت محمدیہ میں کوئی ایسا مسیح آنے والا تھا جس کی آمد کا وعدہ کیا گیا تھا ("مسیح موعود" کے یہ لغظی معنی ہیں) اور وہ "موعودہ مسیح" میرزا صاحب تھے۔ کیا چوھدری صاحب بتائیں گے کہ سارے قرآن میں کہیں کسی جگہ کسی مسیح کی آمد کا وعدہ کیا گیا ہے؟ اگر خدا نے قرآن میں اس قسم کا کوئی وعدہ نہیں کیا تو پھر "مسیح موعود" کا تصور قرآن کی کھلی ہوئی تحریف اور خدا کی کتاب کی مخالفت نہیں تو اور کیا ہے؟ اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں "مسیح موعود" ہوں کیا وہ خدا کے خلاف کھلا ہوا بہتان نہیں تراشتا، کیونکہ وہ کہتا ہے کہ میں وہ مسیح ہوں جس کا وعدہ خدا نے کیا ہے۔ حالانکہ خدا نے کوئی ایسا وعدہ نہیں کیا؟

لہٰذا یا تو یہ ثابت کیجئے کہ خدا نے قرآن میں کسی مسیح کے بھیجنے کا وعدہ کیا ہے۔ اور اگر آپ اسے ثابت نہ کرسکیں تو پھر فرمائیے کہ جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ خدا نے اسے وہ مسیح بنا کر بھیجا ہے جس کا اس نے وعدہ کیا تھا، اس دعویٰ کرنیوالے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے اور قرآن کا کیا حکم؟

(۲) آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ میرزا صاحب نے نبوت کا دعوےٰ کیا ہے۔ یہ بات بہت صاف ہوگئی۔ اب آگے چلئے۔

(۳) آپ نے فرمایا ہے کہ رسول اللہؐ کے بعد کوئی "نیا شارع نبی" نہیں آسکتا۔ البتہ ایسا نبی آسکتا ہے جو شارع نہ ہو۔

کیا چوھدری صاحب فرمائیں گے کہ قرآن میں کسی جگہ شارع اور غیر شارع نبی کی تمیز و تفریق کی گئی ہے؟ کیا اس میں کہیں یہ لکھا ہے کہ نبوت دو قسم کی ہوتی ہے، ایک شریعت والی اور ایک غیر شریعت والی؟ کیا اس میں کہیں یہ مذکور ہے کہ نبی بغیر شریعت کے بھی آیا کرتا ہے؟ (واضح رہے کہ قرآن میں کتاب کا لفظ آتا ہے۔ اس لئے سوال یہ ہوگا کہ کیا قرآن میں کہیں بھی یہ لکھا ہے

کہ نبی بغیر کتاب کے بھی آیا کرتا ہے؟ کیا اس میں کسی ایک نبی کے متعلق بھی لکھا ہے کہ اسے کتاب نہیں دی گئی تھی!]

اگر آپ قرآن سے یہ ثابت نہ کر سکیں تو فرمائیے کہ جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ نبوت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک نبی باکتاب کی اور دوسری نبی بلاکتاب کی۔ اور یہ کہ میں خدا کی طرف سے نبی ہوں بلاکتاب (حالانکہ خدا کہہ رہا ہو کہ میں نے ہر نبی کو کتاب کے ساتھ بھیجا تھا) تو ایسے مدعی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہوگا اور قرآن کا کیا حکم؟

(۴) آپ نے فرمایا ہے کہ ایسا نبی آسکتا ہے جسے اتباعِ نبی اکرمؐ سے نبوت ملی ہو۔

کیا چوھدری صاحب فرمائیں گے کہ قرآن میں کہیں بھی یہ لکھا ہے کہ ایک نبی کی اتباع سے کوئی شخص نبی بن سکتا ہے؟ کیا قرآن نے کسی ایسے نبی کا ذکر کیا ہے جو کسی دوسرے نبی کی اتباع سے خود نبی بن گیا ہو؟

اگر قرآن میں یہ کہیں مذکور نہ ہو کہ جو شخص نبی کی اتباع کرے وہ خود نبی بن سکتا ہے اور نہ ہی اس نے کسی ایسے نبی کا ذکر کیا ہو۔ تو جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ میں نبی اکرمؐ کی اتباع سے نبی بن گیا ہوں، اس کے اس دعوے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہوگا!

(۵) آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ میرزا صاحب کی نبوت، رسول اللہؐ کی نبوت کا ظل یا جزو تھی۔

کیا چوھدری صاحب بتائیں گے کہ قرآن میں کہیں بھی یہ لکھا ہے کہ کوئی نبوت کسی دوسری نبوت کا ظل یا جزو بھی ہوتی ہے؟ کیا قرآن نے کسی نبی کو کسی دوسرے نبی کا ظل یا جزو قرار دیا ہے؟ کیا اس میں کسی ظلی یا جزئی نبی کا ذکر تک بھی ہے؟

اگر قرآن میں اس قسم کا کوئی تصور نہیں تو کیا وہ فرمائیں گے کہ جو شخص اس قسم کے غیر قرآنی عقیدہ کی بنیاد پر اپنی نبوت کی عمارت استوار کرے، قرآن کی رو سے اسے کیا کہنا چاہیئے؟

(۶) چوھدری صاحب نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی باطنی حفاظت کیلئے ظلی نبوت کا سلسلہ جاری فرمایا؟

کیا چوھدری صاحب فرمائیں گے کہ قرآن نے کہیں بھی اپنی ظاہری اور باطنی حفاظت کی تخصیص کی ہے؟ کیا قرآن میں کہیں بھی اسکی باطنی حفاظت کا ذکر ہے؟ کیا اللہ نے قرآن میں کسی جگہ بھی لکھا ہے کہ قرآن کی ظاہری حفاظت تو ویسے ہی ہوتی رہے گی، لیکن اس کی باطنی حفاظت کے لئے ظلی نبوت کا سلسلہ جاری کیا جائے گا؟

جن حضرات نے قرآن کا مطالعہ کیا ہے وہ ہم سے متفق ہوں گے کہ جو عقائد چوھدری صاحب نے پیش کئے ہیں ان میں سے کسی ایک کی سند بھی قرآن کریم سے نہیں مل سکتی۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ چوھدری صاحب کا قرآن کے متعلق مبلغ علم کیا ہے؟ باقی رہی عام بصیرت، سو اس کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ میرزا صاحب کا ایک دعویٰ مشہور ہے کہ جب وہ بعض کاغذات پر دستخط کرانے کے لئے اللہ میاں کے پاس گئے تو اللہ نے دستخط کرنے سے پہلے اپنے قلم کو چھڑکا اور اس کی روشنائی کے چھینٹے ان کے کرتے پر پڑ گئے۔ چنانچہ انھوں نے وہ چھینٹے لوگوں کو دکھائے۔ چوھدری صاحب فرماتے ہیں کہ یہ چھینٹے واقعی اللہ میاں کے قلم چھڑکنے سے پڑے تھے" اور ہم نے اپنی آنکھوں سے انھیں دکھا" (ص۲۰)۔ اس سے آپ خیال

فرمایئے کہ خود خدا، اس کے قلم اور اس قلم کی روشنائی کے متعلق چودھری صاحب کا کیا عقیدہ ہے اور اس قسم کا عقیدہ، قرآن تو ایک طرف، انسانی بصیرت کی رو سے بھی کیسا ہے؟

ہم نے جو کچھ اوپر لکھا ہے، اگر چودھری صاحب موصوف اس کے جواب میں کچھ لکھنا چاہیں تو طلوع اسلام اسے بخوشی شائع کرے گا بشرطیکہ جو کچھ لکھا جائے صرف قرآن سے لکھا جائے۔ اس لئے کہ قرآن کے علاوہ جو کچھ ہے ظنی اور متنازعہ فیہ ہو سکتا ہے حتیٰ کہ احادیث کے متعلق تو خود

حضرت مسیح موعود فرمایا کرتے تھے کہ حدیثوں کی کتابوں کی مثال مداری کے پٹارے کی سی ہے جس طرح مداری جو چاہتا ہے اس میں سے نکال لیتا ہے اسی طرح ان سے جو چاہو نکال لو۔

(میاں محمود احمد صاحب خلیفہ قادیان کا خطبہ جمعہ مندرجہ الفضل مورخہ ۱۵ر جولائی ۱۹۲۴ء)

اور جب خود میرزا صاحب کے نزدیک احادیث تک کی یہ حیثیت ہے تو ان سے نیچے اور کونسی سند حتمی اور یقینی قرار پا سکتی ہے لہٰذا جو سند دی جائے قرآن سے دی جائے۔ ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین۔

معراجِ انسانیت

معارف القرآن جلد چہارم

ترجمانِ حقیقت جناب پرویز کا قلم اور سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام، خود قرآن کے آئینے میں۔ فی الحقیقت ہمارے اسلامی لٹریچر میں اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور نہایت کامیاب۔ شروع میں قریب پونے دو سو صفحات میں دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر ہے۔ اس میں بعض ایسے مذاہب کا بھی تذکرہ ہے جن کا شاید نام بھی آپ نے پہلے نہ سنا ہوگا۔ پھر نادر عنوانات کے ماتحت سیرت حضور سرور کائنات جس میں دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ اصل کتاب بڑے سائز کے ۸۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ مقدمہ وغیرہ کے ابتدائی پچاس صفحات اس سے الگ ہیں۔

کاغذ اعلیٰ درجہ کا ولایتی گلیزڈ۔ جلد مضبوط اور حسین۔ گردپوش مرصع اور دیدہ زیب۔ ٹائیٹل اور صبح بہار کے عنوانات منقش اور رنگین۔ قیمت بیس روپے۔ محصول ڈاک و پیکنگ ایک روپیہ ساڑھے چھ آنے

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ کوی روڈ۔ (صدر) کراچی

باب المراسلات

طلوعِ اسلام اور جماعتِ اسلامی

پنجاب سے ایک صاحب لکھتے ہیں۔

مجھے کافی احباب نے یہ شکایت کی ہے کہ طلوع اسلام نے جماعت اسلامی اور مودودی صاحب کے خلاف جو مہم چلا رکھی ہے اس کی وجہ سے وہ اپنا وقار اور مقبولیت کھو رہا ہے۔ یہ عام طبقہ کی رائے ہے کہ ایسے نازک وقت میں طلوع اسلام کو اتنی سختی سے جماعت اسلامی کے خلاف قدم نہیں اٹھانا چاہئے تھا جبکہ پنجاب میں مرزائیوں کے خلاف ایک مہم چلائی گئی۔ کافی اصحاب نے محض اس پالیسی سے تنگ آکر طلوع اسلام کا مطالعہ ترک کر دیا ہے۔

دوسرے طلوع اسلام نے قادیانیت کے خلاف کچھ بھی تو حصہ نہیں لیا حالانکہ وہ ایک ایسی تحریک کا نقیب ہے جس کا اولین اور بڑا مقصد ہی ایسی جماعتوں کے خلاف ہے۔ اس نے پنجاب کے واقعات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا بلکہ الٹا مودودی صاحب کے خلاف اور تیزی سے لکھنا شروع کر دیا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حکومت کے ایما پر سب کچھ لکھا جا رہا ہے۔

اس سے بھی طلوع اسلام کی تحریک کو دھکا پہنچ رہا ہے۔ تیسرے جماعتِ اسلامی کے خلاف جو تحریریں ہیں وہ سوقیانہ پن لئے ہوئے ہیں جو کہ طلوع اسلام کی شان اور معیار کے سراسر خلاف ہیں۔

ہمیں اس ضمن میں کچھ اور خطوط بھی موصول ہوئے ہیں اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اس مسئلہ پر ذرا وضاحت سے بات کی جائے۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ "طلوع اسلام" ہے کیا؟ طلوع اسلام کوئی تفریحی رسالہ نہیں کہ اس میں وہ باتیں شائع ہوں جس سے لوگوں کی طبیعت خوش ہو جائے۔ نہ ہی اس سے مقصود "شاعری" ہے کہ وہ جذبات میں بہہ جانے والے عوام کو کبھی تخیلات کی اس وادی میں لے جائے اور کبھی تصورات کے اس میدان میں۔ نہ ہی اس کے پیش نظر تجارت ہے کہ یہ اپنے ہاں وہی "مال" رکھے جس کی بازار میں مانگ ہے اور اس امر کا ہمیشہ خیال رکھے کہ زیادہ سے زیادہ گاہکوں کا رجحان کس طرف ہے۔

طلوع اسلام اپنے سامنے ایک متعین نصب العین رکھتا ہے اور اس کا ہر قدم اسی نصب العین کی طرف اٹھتا ہے۔ اس کی دعوت بھی یہی ہے کہ جو لوگ اس نصب العین پر یقین رکھتے ہیں اور اسی منزل کو اپنی منزل سمجھتے ہیں وہ اس سفر میں اس کے رفیق بن جائیں تاکہ اس طرح راستہ آسانی سے کٹ جائے۔ اسے جس قدر زیادہ سے زیادہ رفقائے سفر مل سکیں ان کے لئے اس کے دیدہ و دل فرش راہ ہیں۔ لیکن اگر اس راہ میں اسے کوئی رفیق بھی نہیں ملتا تو یہ اپنی راہ چھوڑ کر کوئی دوسری راہ اختیار نہیں کر سکتا، محض اس بنا پر کہ اس راہ پر لوگوں کا جم غفیر چل رہا ہے۔ لہٰذا اگر طلوع اسلام کو اس کا اطمینان ہے کہ اس کا قدم اپنے راستے پر ٹھیک اٹھ رہا ہے

تو اسے اس سے قطعاً غرض نہیں ہے کہ اس کی مقبولیت کم ہو رہی ہے یا زیادہ اور لوگوں کی نگاہوں میں اس کا وقار بڑھ رہا ہے یا گر رہا ہے۔ اسے دیکھنا صرف یہ ہے کہ اس کا قدم اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے یا نہیں۔

لہٰذا جو لوگ طلوع اسلام کو محض تفریحی رسالہ سمجھتے ہیں یا ان کا یہ خیال ہے کہ یہ ہر حال میں ان کے جذبات کا ساتھ دیتا جائیگا وہ جتنی جلدی طلوع اسلام سے قطع تعلق کرلیں بہتر ہے۔ یہ خود ان کے حق میں بھی بہتر ہوگا اور طلوع اسلام کے حق میں بھی۔ ان کا وقت، پیسہ، اور توانائی بچ رہے گی اور طلوع اسلام اس غلط فہمی سے نکل جائیگا کہ یہ حضرات اس کے رفقائے سفر ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ طلوع اسلام کا نصب العین کیا ہے؟ سو اس کی بابت ہم شروع سے اعلان کرتے چلے آرہے ہیں کہ اس کا نصب العین یہ ہے کہ دین (نظام زندگی) خالص قرآن کے مطابق متشکل ہوجائے۔ طلوع اسلام، اپنے اس نصب العین کی "توحید" میں کسی قسم کا "شرک" برداشت نہیں کرسکتا۔ وہ "دین خالص" میں ذرا سی آمیزش کو بھی کفر سمجھتا ہے۔ وہ خدا کی عبادت (قوانین خداوندی کی اطاعت) میں ہر قسم کی ملاوٹ کو ظلم عظیم قرار دیتا ہے خواہ اس کے ساتھ تقدس کے کتنے کتنے بڑے لیبل کیوں نہ چسپاں ہوں۔ اس سے ظاہر ہے کہ طلوع اسلام کا رفیق سفر صرف وہی ہوسکتا ہے جو اس نصب العین پر یقین محکم اور ایمانِ خالص رکھتا ہو۔ جو اس توحید میں کسی قسم کی آمیزش کو بھی گوارا رکھ سکتا ہے، اس کا اور طلوع اسلام کا کوئی ساتھ نہیں۔ وہ جتنی جلدی اس سے الگ ہوجائے اتنا ہی اچھا ہے۔ طلوع اسلام کو ایسی رفاقت ایک قدم کیلئے بھی منظور نہیں۔

اب آگے بڑھیے۔ اس نصب العین پر ایمان رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ جو راستہ اور جو مسلک اس کے خلاف جائے اس سے کھلا کھلا انکار کیا جائے اور اس راستے پر چلنے والوں سے برملا یہی زبان میں کہدیا جائے کہ کفرنا بکم وبدا بیننا وبینکم العداوۃ والبغضاء ابداً حتی تومنوا باللّٰہ وحدہٗ۔ اس لئے کہ قرآن نے جہاں ایمان باللہ کا حکم دیا ہے اس کے ساتھ ہی کفر بالطاغوت کا بھی حکم دیا ہے۔ لہٰذا یہ ہو نہیں سکتا کہ ہم قوانینِ خداوندی کی اطاعت پر ایمان رکھیں اور ان لوگوں سے محبت اور موافقت کے تعلقات قائم کریں جو غیر خدائی قوانین کی اطاعت کی طرف دعوت دیتے ہوں۔ اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ ہم ان لوگوں سے مداہنت برتیں یا ان سے مفاہمت (COMPROMISE) کرلیں تو وہ اس خیالِ خام و توقع باطل کو جسقدر جلد اپنے ذہن سے نکال دے اچھا ہے! اگر اس سے کسی کے دل کو ٹھیس لگتی ہے تو ہمیں اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ اگر کوئی ہم سے اس باب میں اپنے جذبات کی رعایت چاہتا ہے تو اسے اس سے قطعاً مایوس ہوجانا چاہیے۔ اگر طلوع اسلام کا کوئی "خریدار" اس نقطہ پر قطع تعلق کرنا چاہتا ہے تو قسم ہے اس رب العزت کی جو غنی عن العالمین ہے کہ ایک "خریدار" نہیں۔ اگر اس کے سارے کے سارے "خریدار" بھی اس سے الگ ہوجائیں تو یہ ایک لمحہ کے لئے بھی پلٹ کر نہیں دیکھے گا کہ اس سے کون کون الگ ہورہا ہے۔ طلوع اسلام فاقے برداشت کرسکتا ہے۔ اس نے مسلسل فاقے برداشت کئے ہیں۔ اس کی اب بھی فاقوں ہی میں کٹ رہی ہے۔ لیکن (یہ اللہ کی دی ہوئی توفیق اور ہمت کے صدقے ہیں) نہایت جرأت و فخر اور کامل بے باکی و بلند آہنگی سے کہہ سکتا ہے کہ اس نے آجتک نہ کبھی مداہنت سے کام لیا ہے اور نہ مفاہمت سے۔ اس کے راستے میں قوتیں حائل ہوئیں اور دولتوں نے اسے اپنی طرف کھینچا۔ لیکن اس نے

ہمیشہ قوت کا مقابلہ کیا اور دولت کو ٹھکرایا لیکن حق کہنے میں کسی کے جذبات کی رعایت نہیں کی حقیقت یہ ہے کہ بیع و شری کی منڈیوں میں سوداگری کرنے والے جان ہی نہیں سکتے کہ قرآن کا نفرِ غیور اپنی بے سروسامانی میں بھی کس متاعِ بے بہا کا مالک ہوتا ہے! انھیں پتہ ہی نہیں کہ اس کے دروازے کا گدائے بے نیاز چشمۂ حیواں پر پہنچکر اپنا پیالہ توڑ دیتا ہے۔ لہذا جو "خریدار" یہ سمجھتا ہے کہ طلوعِ اسلام اس کے جذبات کی رعایت میں مخالف سمت پر جانے والوں سے مداہنت برتے گا۔ وہ اپنے معاملے کو جتنی جلدی طلوعِ اسلام سے صاف کرلے، اچھا ہے۔ ہم نے خریدار کے لفظ کو واوین میں اس لئے لکھا ہے کہ قارئین طلوعِ اسلام، پرچے کی جو قیمت ادا کرتے ہیں وہ اس کے کاغذ طباعت وغیرہ کی قیمت ہوتی ہے ورنہ طلوعِ اسلام کی قیمت کون ادا کرسکتا ہے اور اسے کون خرید سکتا ہے؟

اس تمہید کے بعد آگے بڑھیے۔ طلوعِ اسلام کو جو قرآنی بصیرت عطا ہوئی ہے اس کی روشنی میں وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ مسلمانوں کو قرآن سے دور رکھنے کے لئے جو قوتیں مصروفِ عمل رہی ہیں (اور آج بھی مصروفِ عمل ہیں) ان میں ملائیت کا حصہ بڑا نمایاں ہے۔ اس کے نزدیک ملائیت قرآن اور مسلمان دونوں کی بدترین دشمن ہے۔ اسلئے طلوعِ اسلام ملائیت کی مخالفت کو اپنی زندگی کا اولیں فریضہ سمجھتا ہے۔ اس کا یقین ہے کہ شجرِ ملت کبھی سرسبز و شاداب نہیں ہوسکتا جب تک اس کے اوپر سے اس "اکاس بیل" کو اتارا نہیں جائے گا۔

اگر آپ طلوعِ اسلام کے اس نتیجہ (FINDING) سے متفق نہیں ہیں، یا آپ کو اس کی کاوش نہیں کہ معلوم کیا جائے کہ ملائیت نے اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ کیا کچھ کیا ہے، تو آپ طلوعِ اسلام کا مطالعہ بالکل نہ کیجئے۔ اس کے پڑھنے سے یہی نہیں کہ آپ کو کچھ فائدہ نہیں ہوگا بلکہ (اگر آپ عام ملا زدہ طبقہ کی طرح کمزور اعصاب کے واقع ہوئے ہیں تو) اس سے آپ کے غصے اور نفرت کے جذبات بڑھیں گے جس سے آپ کے دماغی توازن پر اثر پڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ (ہمیں مخالفین کی طرف سے جو خطوط آتے ہیں ان میں سے اکثر اسی حقیقت کے آئینہ دار ہوتے ہیں کہ لکھنے والے کا دماغی توازن درست نہیں)۔

اس سلسلہ کی اگلی کڑی یہ ہے کہ ہمارے نزدیک پاکستان میں ملائیت اپنی سب سے زیادہ خطرناک شکل میں، جماعتِ اسلامی کے پیکر میں پائے کوب ہے، اس لئے کہ اس جماعت کے مقاصد سیاسی ہیں اور حربے ملائیت کے۔ ہم اس جماعت کو پاکستان اور اسلام دونوں کے دشمن سمجھتے ہیں۔ پاکستان کے دشمن اس لئے کہ یہ لوگ تحریکِ پاکستان کے دوران میں پاکستان کی سخت مخالفت کرتے رہے۔ اب پاکستان کے ساتھ ان کی دلچسپی اتنی ہے کہ وہ زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں۔ اگر انھیں آج یقین ہوجائے کہ ان کا یہ مقصد پورا نہیں ہوسکتا تو اس کے بعد انھیں اس کی قطعاً پرواہ نہیں ہوگی کہ پاکستان رہتا ہے یا جاتا ہے۔

اور اسلام کی دشمنی اس لئے کہ اگر یہاں زمامِ اقتدار اُن کے ہاتھ میں آگیا تو پھر یہاں قرآن کے نافذ العمل ہونے کی کوئی صورت باقی نہیں رہے گی۔ مسلمانوں کی تیرہ سو سال کی تاریخ بتا رہی ہے کہ ملا نے ہمیشہ مسلمان کو قرآن سے دور رکھا ہے (اس لئے کہ قرآن آجانے سے ملا باقی نہیں رہتا)، نہ صرف قرآن سے، بلکہ عقل و بصیرت سے بھی دور۔ اگر پاکستان میں قوت

ملّا کے ہاتھ میں آگئی تو یہاں ظلم و استبداد کا وہی نقشہ قائم ہو جائے گا جو ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ میں "شرعی احتساب" (INQUISITION) کے ہاتھوں قائم ہوا تھا۔ ہم یہ کچھ محض قیاساً نہیں لکھ رہے، بر بنائے دلیل و شہادت لکھ رہے ہیں۔ آپ مودودی صاحب کی کتاب "اسلام میں مرتد کی سزا" کا مطالعہ کیجئے، آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔ انھوں نے ابھی سے فتویٰ دیدیا ہے کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ہر وہ مسلمان مرتد سمجھا جائے گا جس کے متعلق "ارباب شریعت" یہ فیصلہ کردیں کہ اس کے "عقائد" دین حقہ" کے مطابق نہیں ہیں۔ اور اس چیز کو وہ پاکستان کے دستور میں شامل کرانا چاہتے ہیں کہ امور شرعی میں آخری فیصلہ "علمائے کرام" کے ہاتھ میں ہوگا۔ ذرا سوچئے کہ اس صورتِ حالات کا نتیجہ کیا نکلے گا؟

بہر حال ہم جماعتِ اسلامی کو نظامِ قرآنی کی راہ میں سب سے بڑا روڑا اور پاکستان کا دشمن سمجھتے ہیں۔ جو لوگ ہمارے اس نتیجے سے متفق نہیں اور نہ ہی وہ اس کی ضرورت سمجھتے ہیں کہ اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔ انھیں طلوع اسلام کے پڑھنے سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔

اب ہمارا روئے سخن ان حضرات کی طرف ہے جو مندرجہ بالا نتائج سے متفق ہیں اور سب کچھ سوچ اور سمجھ لینے کے بعد طلوع اسلام کے رفقائے سفر ہیں۔ ہمیں ان حضرات کی رفاقت پر ناز ہے۔ ہم ان کے اخلاص کا احترام کرتے ہیں۔ ان کے ذوقِ قرآنی کی ہماری نگاہوں میں بڑی قدر ہے۔ ان کے مشورے ہمارے لئے چراغ راہ اور ان کی نیک آرزوئیں ہمارے لئے زادِ سفر ہیں ہم ان حضرات سے پوچھتے ہیں کہ کیا ان کے نزدیک، اتنے بڑے خطرے کے سدباب کیلئے جس کی تصریح اوپر کی جاچکی ہے، یہ کافی ہوگا کہ طلوع اسلام کبھی کبھار، سرراہے، جماعت اسلامی کی سرگرمیوں کا ذکر کر دیا کرے؟ جماعت اسلامی کے پراپیگنڈے کا یہ عالم ہے کہ بستی بستی۔ قریہ قریہ۔ گاؤں گاؤں، ان کے مراکز موجود ہیں جن میں چلتے پھرتے مبلغ کام کرتے رہتے ہیں۔ متعدد جرائد اور رسائل ان کی آواز کو اطراف و اکنافِ مملکت (بلکہ بیرونِ ملک) تک پہنچاتے رہتے ہیں۔ ان کا لٹریچر گلی گلی۔ محلہ محلہ۔ فروخت ہوتا ہے اس تمام شور و شغب کے مقابلے میں، ایک طلوع اسلام کی خفیف سی آواز ہے جو لوگوں کو ان کے خطرات سے آگاہ کرکے قرآن کی طرف دعوت دیتی ہے۔ کیا ان حالات میں آپ سمجھتے ہیں کہ طلوع اسلام کی طرف سے جماعتِ اسلامی کی مسلسل مخالفت "زیادتی" ہے؟ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ اس مقصد کے لئے اگر طلوع اسلام کے مسلک کے دس روزنامے بھی ملک میں شائع ہوں تو کم ہیں۔ جو لوگ طلوع اسلام میں جماعتِ اسلامی کی مسلسل مخالفت کو "زیادتی" سمجھتے ہیں انھوں نے درحقیقت اس خطرے کی اہمیت اور اس کی ہمہ گیریت کا صحیح صحیح اندازہ نہیں لگایا جنھیں اس کا صحیح صحیح اندازہ ہے ان کا بیتابانہ اصرار ہے کہ طلوع اسلام کو جلد از جلد روزنامہ میں تبدیل کیا جائے اور اس کے لٹریچر کو زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے۔

باقی رہا یہ کہ طلوع اسلام کو اس جماعت کی اس زمانے میں مخالفت نہیں کرنی چاہئے تھی جب وہ حوادثِ پنجاب کے عواقب میں ماخوذ ہے۔ تو یہ آواز ٹھیک ان سطحی جذبات کی ترجمان ہے جسے (EXPLOIT) کرنے کیلئے یہ لوگ اس قسم کے مواقع پیدا کرتے رہتے ہیں اور پھر ان خطرات میں دیدہ و دانستہ کود پڑتے ہیں۔ اس قسم کے حربے جذباتی قوموں میں بڑے کارگر ثابت ہوتے ہیں۔

مفاد پرست سیاسئین جب یہ خدشہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے نقاب باریک ہو رہے ہیں اور ان کی مقبولیت میں فرق آرہا ہے تو یہ اپنے پارٹی پروگرام کو کچھ وقت کے لئے ایک طرف رکھ دیتے ہیں اور کوئی ایسی تحریک شروع کر دیتے ہیں جو عام لوگوں میں مشترک ہو اور ان کے جذبات بھڑک اٹھیں۔ ایک تو عوام کا حافظہ ویسے ہی کمزور ہوتا ہے۔ پھر جذبات کی رو میں رہا سہا احساس بھی بہہ جاتا ہے نتیجہ یہ کہ لوگ ان کی پچھلی تاریخ کو (PREVIOUS HISTORY) کو بھول جاتے ہیں اور ان کے "زندہ باد" کے نعرے لگانے لگ جاتے ہیں۔ اس طرح یہ لوگ اپنی لیڈرشپ کی گرتی ہوئی عمارت کو از سر نو قائم کر لیتے ہیں۔ اور اگر اس کے ساتھ حکومت کا عدمِ تدبر بھی شامل ہو جائے تو پھر ان کے "ہیرو" بننے میں کوئی کسر ہی نہیں رہ جاتی۔

یہی کچھ گذشتہ دنوں حوادثِ پنجاب کے سلسلے میں ہوا ہے اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ ان لوگوں کی بساط آرائیوں اور مہرہ بازیوں اور ارباب حل و عقد کی ناعاقبت اندیشیوں اور غلط کوشیوں سے ان کے اقتدار کے گرتے ہوئے گنبد پھر سے استوار ہو گئے۔ اسی کا اثر ہے جو طلوعِ اسلام سے کہا جاتا ہے کہ اسے ان دنوں تو جماعتِ اسلامی کی مخالفت نہیں کرنی چاہئے تھی! یعنی ان لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ ویسے تو جماعتِ اسلامی کی مخالفت ضروری ہے لیکن چونکہ ان دنوں ان کے لیڈر گرفتار ہو چکے ہیں اسلئے اب ان کی مخالفت نہیں کرنی چاہئے بلکہ کہنا یہ چاہئے کہ یہ لوگ اسلام کے سچے خادم۔ ملت کے مخلص بہی خواہ اور پاکستان کے جاں نثار سپاہی ہیں اس لئے ملت کو چاہئے کہ انھیں اپنا ہیرو سمجھے!

طلوع اسلام سے یہ نہیں ہو سکے گا کہ وہ زہر کو اسلئے تریاق کہدے کہ اس پر شکر چڑھا کر (SUGAR - COATED) بنا دیا گیا ہے۔ اس مقام پر تو اس کی آواز کو اور بلند ہو جانا چاہئے تاکہ جو سادہ لوح انسان اس زہر کو شکر سمجھ کر کھا جانے پر آمادہ ہوں انھیں اس ہلاکت سے بچایا جائے۔ قرآن کا مطالبہ یہ ہے کہ مخالفین سے عدل کیا جائے۔ اگر آپ نے دیکھنا ہو کہ اس باب میں طلوع اسلام نے کس طرح اختلاف کو بالائے طاق رکھکر مودودی صاحب اور دیگر گرفتاران حوادث پنجاب کے لئے عدل کا مطالبہ کیا تھا تو اس کی اشاعت بابت جون ۱۹۵۳ء کے لمعات پڑھئے۔ آپ کو نظر آجائے گا کہ اس زمانے میں جبکہ ہنوز لوگوں کے دلوں سے مارشل لا کے خوف کا بھوت اترا نہیں تھا، طلوع اسلام نے کس بیباکی سے مطالبہ کیا تھا کہ اگر مودودی صاحب کو ان کی مدافعت کا پورا پورا موقعہ دیئے بغیر، سزا دیدی گئی ہے تو ان کا مقدمہ کسی سول عدالت میں از سر نو دائر ہونا چاہئے جس میں انھیں اپنی صفائی پیش کرنے کی اطمینان بخش سہولتیں میسر ہوں۔ یہ آواز سب سے پہلے طلوع اسلام کی طرف سے اٹھی تھی۔ ایک مخالف کے لئے عدل طلبی کی اس سے بڑھ کر مثال اور کیا ہو سکتی ہے؛ لیکن اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ طلوع اسلام اس دعوت اور مسلک کی مخالفت (جو جماعت اسلامی کی طرف سے پیش کی جا رہی ہے) اس لئے چھوڑ دے کہ اس کے چند ایک لیڈر گرفتار ہو چکے ہیں تو ہم نہیں سمجھتے کہ آپ کا یہ مطالبہ کس طرح جائز اور معقول قرار پا سکے گا۔ طلوع اسلام جماعتِ اسلامی کے لیڈروں کا مخالف نہیں، وہ مخالف ہے اس دعوت اور تحریک کا جسے لیکر وہ جماعت اٹھی ہے۔ اسلئے جب تک وہ دعوت اور تحریک باقی ہے، طلوع اسلام کی طرف سے اس کی مخالفت جاری رہے گی۔ اگر جماعتِ اسلامی کے لیڈر اور کارکن اس دعوت اور مسلک کو چھوڑ دیں تو

طلوعِ اسلام سب سے پہلے آگے بڑھ کر انھیں سینے سے لگائے گا۔ طلوعِ اسلام اِس تحریک کی مخالفت کس طرح چھوڑ دے جسے وہ اپنی بصیرت کے مطابق قرآن اور پاکستان دونوں کے لئے خطرناک سمجھتا ہو۔ قرآن، طلوعِ اسلام کے لئے رگِ حیات ہے اور پاکستان سے اسے محبت اس لئے ہے کہ وہ اس خطۂ زمین پر قرآن کے نظامِ ربوبیت کو متشکل دیکھنا چاہتا ہے۔ لہٰذا جو فرد، جماعت، یا تحریک، قرآن اور پاکستان کی مخالف ہو، اس کی مخالفت طلوعِ اسلام کی زندگی کا مقصد ہے۔ اگر وہ اپنے اس مقصد میں کوتاہی کرتا ہے تو وہ اپنے دعوے سے غداری برتتا ہے۔ اور اگر اسے بالکل چھوڑ دیتا ہے تو پھر اس کی ہستی کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

آپ لکھتے ہیں کہ طلوعِ اسلام نے قادیانیت کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ اگر آپ بھول چکے ہوں تو آپ کو یاد دلایا جائے کہ طلوعِ اسلام کی طرف سے "احمدیت اور اسلام" کا پمفلٹ اس زمانے میں شائع ہوا تھا جب "اینٹی قادیانیت" کی تحریک کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھی۔ اس پمفلٹ کو دیکھئے اور پھر سوچئے کہ قادیانیت کے تردید میں اس سے بہتر دلائل کہیں اور بھی آپ کو مل سکتے ہیں؟ اس کے دلائل کی محکمیت کا یہ عالم ہے کہ آج تک میرزائی جماعت کو جرأت نہیں ہو سکی کہ اس کا جواب لکھ سکے۔ (اور آپ دیکھیئے گا کہ میرزائی تحریک کو جب بھی شکست ہو گی، انہی دلائل و شواہد سے ہو گی جو اس پمفلٹ میں مذکور ہیں۔ ملا کے پیش کردہ دلائل تو الٹے اس کی تقویت کا موجب بن رہے ہیں۔)

اب رہا یہ کہ ہم نے "اینٹی قادیانیت" تحریک کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ سو اس کے لئے طلوعِ اسلام بابت اپریل ۱۹۵۳ء کا عنوان "باچشمِ نم" دیکھئے جس میں ہم نے اجمالی طور پر سب کچھ لکھ دیا تھا اور تفصیلی طور پر لکھنے کو اس وقت پر اٹھا رکھا تھا جب فضا میں سکون اور جذبات میں ٹھہراؤ پیدا ہو جائے۔ ہم ایسے وقت کے انتظار میں تھے کہ پنجاب انکوائری کمیٹی کا تعین ہو گیا اور یہ سارا قصہ ان کی تحقیقات کے احاطہ کے اندر آ گیا۔ اس کمیٹی کی حیثیت عدالت کی سی ہے اس لئے اب اس کیس کے متعلق کچھ لکھنا دائرہ عدالت میں مداخلت کے مرادف سمجھا جائے گا۔ لہٰذا ہم مجبور ہیں۔ ہم اس مقام پر اتنا عرض کر دینا چاہتے ہیں، اگر ہم اس کے متعلق تفصیل سے لکھتے تو آپ کی یہ شکایت کہ طلوعِ اسلام مودودی صاحب کی مخالفت میں زیادتی کر رہا ہے، اور بھی بڑھ جاتی۔ اس سارے قصے میں سب سے زیادہ اہمیت مودودی صاحب کے رسالہ "قادیانی مسئلہ" کو دی جاتی ہے۔ ہمارے نزدیک اس رسالہ کے دلائل اسقدر پوچ ہیں کہ اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو وہ خود احمدیوں کے حق میں چلے جاتے ہیں۔ اسلئے اگر (اس عدالتی مجبوری کی بنا پر جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے) طلوعِ اسلام نے اس رسالہ کا تجزیہ نہیں کیا تو یہ چیز مودودی صاحب اور ان کے ہم نواؤں کے حق میں ہی گئی ہے۔ میرزائیت کے مسئلے کی نوعیت یہ ہے کہ اگر اسے خالص قرآن کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو میرزا غلام احمد کی نبوت تو ایک طرف، ان کا اسلام بھی باقی نہیں رہتا۔ (اور طلوعِ اسلام کا مسلک ظاہر ہے کہ یہ ہر مسئلہ کو خالص قرآنی نقطۂ نگاہ سے دیکھتا ہے) لیکن اگر اس مسئلہ کا فیصلہ روایات کی رو سے کیا جائے تو کوئی اعتراض

ایسا نہیں جس کا جواب میرزائیوں کی طرف سے نہ دیا جاسکے۔ روایات کی رو سے قریب ساٹھ ستر برس سے میرزائیوں کے ساتھ مناظرے اور مباحثے ہو رہے ہیں لیکن یہ مسئلہ گرداب میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح اپنے مقام سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھا۔ اگر اس مسئلہ پر خالص قرآن کی روشنی میں بحث کی جاتی تو سارا قصہ چند منٹ میں طے ہو جاتا۔ لیکن ہمارے ملا قرآنِ خالص کو اس لئے سامنے نہیں لاسکتے کہ اس کی رو سے اگر میرزائیت ختم ہو جاتی ہے تو اس کے ساتھ ہی ملائیت بھی جاتی ہے۔

اب رہا یہ کہنا کہ طلوعِ اسلام کی طرف سے جماعتِ اسلامی کی مخالفت حکومت کے ایماء سے ہو رہی ہے تو اس جماعت کی طرف سے یہ حربہ بھی کوئی نیا حربہ نہیں ہے۔ یہی کچھ یہ لوگ طلوعِ اسلام کے متعلق ہندوستان میں کہا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں ان کا کہنا یہ تھا کہ طلوعِ اسلام تحریکِ پاکستان کی حمایت (فلہذا جماعتِ اسلامی کی مخالفت) حکومت کے ایماء سے کرتا ہے یعنی ان کے کہنے کے مطابق ہندوستان میں انگریز اور ہندو (جن کی وہاں حکومت تھی) یہ چاہتے تھے کہ پاکستان قائم ہو جائے اور جو شخص پاکستان کی حمایت کرتا تھا وہ حکام پرست تھا۔ حکومت کے اثر سے آزاد وہ لوگ تھے جو پاکستان کی مخالفت کرتے تھے۔ یہی کچھ جماعتِ اسلامی والوں نے یہاں کہنا شروع کر رکھا ہے۔ احراریوں کی بھی یہی ٹیکنیک ہوا کرتی تھی کہ جونہی کسی نے ان کی مخالفت کی انھوں نے شور مچادیا کہ یہ میرزائی ہے۔ اور جب وہ بیچارا چیخا چلایا کہ مجھے میرزائیت سے کوئی واسطہ نہیں تو کہدیا کہ میرزائی نہیں تو میرزائی نواز ضرور ہے۔ یہی حالت جماعتِ اسلامی کی ہے۔ جو شخص ان کی مخالفت کرے وہ "حکومت کا ایجنٹ" ہے — سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں۔

باقی رہا یہ کہ طلوعِ اسلام میں سوقیانہ پن ہے۔ سو اگر ہمارے مراسلہ نگار[1] طلوعِ اسلام کا کوئی فقرہ نقل کر کے یہ لکھتے کہ یہ سوقیانہ ہے تو ہم انھیں بتاتے کہ سوقیانہ کہتے کسے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اس قسم کے حربے جماعتِ اسلامی کی طرف سے اکثر و بیشتر استعمال ہوتے ہیں۔ طلوعِ اسلام میں ان کے خلاف جو کچھ لکھا جاتا ہے ان میں سے کسی بات کا جواب ان کے پاس ہوتا نہیں لیکن وہ اپنی اس شکست کو اس خود ساختہ پندار کے نقاب میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم اس قسم کے ذلیل لوگوں کے منہ نہیں لگنا چاہتے۔ اسی قماش کا یہ اعتراض ہے کہ طلوعِ اسلام کا انداز سوقیانہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم اس کا جواب کیا دے سکتے ہیں؟

بہر حال یہ ہے جماعتِ اسلامی کی تحریک و دعوت سے متعلق طلوعِ اسلام کا مسلک اور یہ ہے اس کا نصب العین حیات۔ ہم تمام قارئین طلوعِ اسلام سے درخواست کریں گے کہ وہ اس مسلک کا غائر نگاہ سے مطالعہ کریں اور اس کے بعد فیصلہ کریں کہ کہ وہ طلوعِ اسلام کے رفیقِ سفر ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ ہم ایک مرتبہ پھر دہرا دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک مسلمانوں کے نظامِ زندگی کی عمارت خالص قرآنی بنیادوں پر اٹھنی چاہئے۔ جو فرد یا جماعت اس بنیادی تصور کا مخالف ہے ہم پوری شدت کے ساتھ اسکی مخالفت کریں گے۔ خواہ وہ کسی گوشہ سے بھی متعلق ہو۔ جو حضرات طلوعِ اسلام کے اس مسلک سے متفق ہیں، ان کی

---

[1] ہمیں معلوم ہے کہ ہمارے یہ مراسلہ نگار جماعتِ اسلامی سے متعلق نہیں۔ لیکن جماعتِ اسلامی نے فضا میں جن خیالات کو پھیلا رکھا ہے انھوں نے ان کی ترجمانی کی ہے۔

رفاقت طلوع اسلام کے لئے فخر و ناز کا موجب اور تقویت و نصرت کا باعث ہے۔ ہم ان کے مشوروں کے شکر گذار اور ان کی تجاویز کے قدر دان ہیں۔ لیکن جو لوگ اس اصل سے متفق نہیں اور نہ ہی اپنے اندر تلاش حقیقت کی تڑپ رکھتے ہیں وہ ہمارے رفیق نہیں بن سکتے۔ نہ ہمیں ان کی نگاہوں میں مقبولیت حاصل کرنے کی خواہش ہے نہ عزت پانے کی تمنا۔ فان العزۃ للہ جمیعاً۔

۲۔ خدا کا قانون

لاہور سے ایک صاحب رقمطراز ہیں کہ آجکل یہ شبہات عام کئے جا رہے ہیں کہ

(۱) طلوع اسلام "خدا کے قانون" کا جو تصور پیش کرتا ہے اس میں خدا گم ہوتا جا رہا ہے۔ یعنی اشتراکیت میں خدا کا کھلا انکار ہے۔ یہاں ذرا سلیقہ سے انکار کی طرف اقدام ہے۔ میٹریل ازم کو آیاتِ قرآنی کا لباس پہنایا جا رہا ہے۔ ذکر و دعا جس سے تسکین حاصل ہوتی تھی ختم ہو رہی ہے۔ "دامانِ خیال یار" ہاتھ سے چھوٹا جا رہا ہے "سعی بے حاصل" کی لذت چھن رہی ہے اور وہ قانون و نظام جس کے لئے یہ قربانی دی وہ بھی حاصل ہونے کی امید نہیں۔ مسئلہ ختم ہوا۔ نیز

(۲) نظام صلوٰۃ نے صلوٰۃ موقوت کی اہمیت کم کر دی ہے۔

جہاں تک خدا کے قانون کا تعلق ہے۔ طلوع اسلام کو قرآن کے ایک ایک صفحہ اور اس کی ایک ایک آیت میں اس کا وہ عظیم القدر قانون جلوہ بار نظر آ رہا ہے جس کی محکم زنجیر میں یہ تمام محیر العقول سلسلۂ کائنات جکڑا ہوا ہے۔ قرآن انسان سے بھی اسی قانون خداوندی کی اطاعت چاہتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قانونِ خداوندی کے اس تصور سے انسانوں کا وہ خود ساختہ "خدا" ختم ہو جاتا ہے جو یہ بتاتا ہے کہ تم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو۔ مصلے پر بیٹھکر دعا مانگتے رہو اور تسبیح کے دانوں پر خدا کے نام کا ورد کرتے رہو۔ باقی سب کچھ تمہارے لئے خود بخود ہو جائے گا۔ لیکن اس سے اس خدائے حکیم و قدیر کا تصور نکھر کر سامنے آ جاتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ لیس للانسان الا ما سعیٰ "انسان کو وہی کچھ مل سکتا ہے جس کے لئے وہ کوشش کرے۔ اس سے بیشک موہوم امیدوں کی جھوٹی لذت اور سعی بے حاصل کا دلفریب کیف چھن جاتا ہے۔ لیکن اس سے خدا کے غیر متبدل وعدوں کا وہ محکم سر رشتہ ہاتھ میں آ جاتا ہے جس کے لئے اس نے خود کہا ہے کہ لا انفصام لہا یعنی وہ کبھی نہیں ٹوٹے گا۔ کتنا جاندار ہے یہ بھروسہ اور کیسا قوت بخش ہے یہ اعتماد۔ جس "دامن" کے متعلق بعد مرگ آنکھیں کھلنے پر نظر آتا ہے کہ وہ "دامنِ یار" نہیں تھا بلکہ اپنا ہی گریباں[۱] تھا، اس کی حقیقت اگر ابھی آنکھوں کے سامنے آ جائے تو زیادہ اچھا ہے۔ اس لئے کہ ابھی تو وقت ہے کہ ہم خواب کی دنیا کے جھوٹے دامنوں کو چھوڑ کر یار کے سچے دامن کو تھامنے کا سامان کر لیں۔ یہ وقت گذر جانے کے بعد اگر پتہ چلا تو اس سے کیا حاصل ہو گا۔

باقی رہا میٹریل ازم کا شبہ، سو اصل یہ ہے کہ لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ میٹریل ازم کہتے کسے ہیں۔ ان کے خیال میں میٹریل ازم کے معنی ہیں دنیاوی خوشگواریوں کا حصول۔ اگر میٹریل ازم کے یہی معنی ہیں تو قرآن کی تعلیم خود میٹریل ازم کی تعلیم ہے۔ وہ

---

[۱] سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں تھا

استخلاف فی الارض کو ایمان و اعمال صالحہ کا لازمی نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک مال و دولت، ازواج و بنون، جاہ و حشمت، خدا کی نعمتیں ہیں۔ وہ بھوک کو خدا کا عذاب اور مرفہ الحالی کو اس کا انعام قرار دیتا ہے۔ سمجھتے کہ یہ (مندرجہ بالا مفہوم کے اعتبار سے) میٹریلزم نہیں تو اور کیا ہے؟

میٹریلزم کے اصلی معنی یہ ہیں کہ انسانی رہنمائی کے لئے تنہا انسانی عقل کافی ہے اور زندگی بس اسی جسم کی زندگی ہے اس کے بعد حیات کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ طلوع اسلام کا ایک ایک لفظ اس باطل تصور کی تردید اور تکذیب کے لئے وقف ہے۔ طلوع اسلام کی دعوت کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ ایمان اور اعمال صالحہ کا لازمی نتیجہ اس دنیا کی خوشحالیاں اور اس کے بعد کی زندگی کی خوشگواریاں ہیں اور یہ چیز صرف قرآن کے پروگرام پر عمل پیرا ہونے سے حاصل ہو سکتی ہے نہ تنہا عقل کی رو سے اور نہ ہی انسانوں کے خود ساختہ مذاہب کے ذریعہ۔ طلوع اسلام کی کوشش یہ ہے کہ پاکستان کے خطۂ زمین میں قرآن کا قانون نافذ ہو اور اس سے خدا کا نظام ربوبیت متشکل ہو۔ اس کی اس کوشش کی کامیابی کا انحصار آپ حضرات کی تائید اور رفاقت میں مضمر ہے۔

باقی رہا یہ سوال کہ نظام صلوٰۃ نے صلوٰۃ موقت کی اہمیت کو کم کر دیا ہے، تو یہ لوگوں کی غلط نگہی ہے۔ نظام صلوٰۃ میں بھی موقت اجتماعات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اتنی بڑی اہمیت کہ ان اجتماعات سے غیر حاضر رہنے والوں سے سخت مواخذہ کیا جائیگا لہذا نظام صلوٰۃ میں موقت فریضۂ صلوٰۃ کی اہمیت کس طرح کم ہو سکتی ہے۔

البتہ اگر اس سے یہ مقصود ہے کہ قرآن کے اس تصور سے موجودہ نمازوں میں کشش اور جاذبیت نہیں رہتی تو دنیا میں جو چیز بھی اپنی روح کو کھو دے گی اور صرف اپنی ظاہری شکل کے قیام پر زور دے گی اس کی جاذبیت ہر اس شخص کے نزدیک ختم ہو جائے گی جو روح کا متلاشی اور نتائج کا متمنی ہو۔ محمد رسول اللہ والذین معہٗ نے انہی موقت اجتماعات صلوٰۃ سے انسانی معاشرے میں ایک ایسا انقلاب پیدا کر دیا تھا جس کی نظیر تاریخ کے اوراق میں نہیں ملتی۔ وہ نمازیں، اپنے تو ایک طرف، غیروں تک کے لئے بھی اپنے اندر کشش اور جاذبیت رکھتی تھیں۔ اگر آج وہ نمازیں اس انقلابی روح سے بیگانہ ہو چکی ہیں اور اس لئے لوگ ان میں کشش نہیں پاتے تو اس کا ذمہ دار طلوع اسلام نہیں۔ طلوع اسلام تو صرف یہ کہتا ہے کہ جس نماز کا نتیجہ وہ انقلاب نہیں جو محمد رسول اللہؐ نے پیدا کر دیا تھا تو وہ نماز، وہ صلوٰۃ نہیں جو محمدؐ رسول اللہ نے قائم کی تھی۔ اگر یہ کہنا جرم ہے تو طلوع اسلام بیشک اس جرم کا اقبالی ہے۔ خود قرآن نے بھی تو ان نمازیوں کے لئے تباہی اور بربادی کا اعلان کیا ہے جن کی نمازوں کے تیر اپنے نشانہ پر جا کر نہیں بیٹھتے۔ (فویل للمصلین الذین ھم عن صلوٰتھم ساھون) یہی کچھ طلوع اسلام کہتا ہے۔ اس سے بیشک لوگوں کی موہوم امیدوں کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔ لیکن جب تک کوئی قوم موہوم امیدوں کے طلسم میں ماخوذ رہے وہ زندگی اور اس کی حرارتوں سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتی۔ فریب اور حقائق دو متضاد عناصر ہیں جو کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔

ہمارے موقت اجتماعاتِ صلوٰۃ میں وہ انقلابی روح اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب یہ اجتماعات نظام قرآن کے پروگرام کے اجزا ہوں۔ لیکن اس کے لئے طلوع اسلام نہ کوئی الگ فرقہ بنانا چاہتا ہے اور نہ ہی نماز کے جداگانہ اجتماعات قائم کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ ہر وہ مسلمان جو سمجھتا ہے کہ ہماری موجودہ نمازیں وہ نتائج نہیں پیدا کرتیں جو نتائج محمد رسول اللہ والذین معہٗ کی نمازوں نے پیدا کئے تھے، اسے کوشش کرنی چاہئے کہ یہ نمازیں قرآنی نظام کے پروگرام کا جزو بن جائیں۔ پھر ان نمازوں میں وہی کشش وجاذبیت پیدا ہو جائے گی جس کی ہر قلب مضطرب کو تلاش ہے۔ (اس موضوع پر تفصیلی طور پر آیندہ ماہ لکھا جائے گا)

معذرت بلکہ ندامت

طلوع اسلام کے اعلان کرنے پر، ملک کے مختلف گوشوں سے، قارئین نے

سلیم کے نام خطوط

قرآنی فیصلے - اور

جشن نامے

کے لئے اپنی فرمائشیں بھیجیں۔ ہمارے پروگرام کے مطابق ان فرمائشوں کی تعمیل شروع اگست میں ہو جانی چاہئے تھی لیکن اگست میں کراچی میں غیر متوقع بارشوں نے طباعت کے کام میں بڑی رکاوٹ ڈال دی۔ اس کے بعد خدا خدا کر کے کتابیں چھپ گئیں تو ہم نے اندازہ کیا کہ ان کی ترسیل، ستمبر میں شروع ہو جائے گی۔ لیکن کتابیں چھپنے کے بعد دیکھا کہ مارکیٹ میں گتہ نہیں ملتا جس سے جلد سازی کی جائے۔ چنانچہ اس وقت حالت یہ ہے کہ کتابیں تیار رکھی ہیں لیکن ان کی جلدیں نہیں بندھ رہیں۔ احباب کی طرف سے تقاضوں پر تقاضے موصول ہو رہے ہیں۔ اور ہم بعد ندامت محسوس کر رہے ہیں کہ ہم ان کے ارشاد کی تعمیل سے قاصر ہیں۔ گتے کے حصول کے لئے بڑی تگ ودو کی جا رہی ہے۔ جونہی جلدیں بندھ گئیں تمام فرمائشوں کی تعمیل بیک وقت کر دی جائے گی۔ ادارۂ طلوع اسلام نے کاروباری معاملات میں ہمیشہ ایفائے عہد کو ملحوظ رکھا ہے لیکن جب حالات اس کے اختیار سے باہر چلے جائیں تو پھر مجبوری کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ امید ہے احباب ہماری اس معذرت کو شرف پذیرائی عطا فرمائیں گے۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ کوی روڈ۔ صدر۔ کراچی

رفتارِ عالم

کوریا کی جنگ کہنے کو تو ختم ہوگئی ہے، لیکن در اصل وہ ایک نئی منزل میں داخل ہوئی ہے۔ جنگ بدستور لڑی جارہی ہے البتہ اس کے حربے بدل گئے ہیں۔ تین سال، ایک ماہ اور دو دن کی مسلسل خونریزی اور ہلاکت آفرینی کے بعد کوئی ایک فریقِ محارب بھی دعویٰ سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے مقاصد کی ذرہ بھر بھی تکمیل ہوگئی ہے۔ جو مسائل جنگ سے پیشتر موجود تھے وہ ویسے کے ویسے لاینحل ہیں۔ خود کوریا ہی کو لیجئے۔ دونوں فریق اس کو متحد دیکھنا اور کرنا چاہتے ہیں لیکن دونوں آج بھی قریباً اسی مقام پر ہیں جہاں تین سال پہلے تھے کوریا درحقیقت مظہر ہے اس گہرے تصادم کا جو کمیونسٹ ممالک اور ان کے حریفوں کے مابین برپا ہو چکا ہے۔ یہ تو محض ایک اتفاقی امر ہے کہ یہ لاوا وہاں پھوٹ نکلا، ورنہ اس کشمکش کے تقاضے اتنے عالمگیر ہو چکے ہیں کہ اب اس کا فیصلہ مقامی جنگوں سے ناممکن ہے بہرحال اس معاہدۂ صلح سے جو مسائل خصوصیت سے ابھر کر سامنے آئے ان میں سب سے نمایاں چین کا مسئلہ ہے۔ یہ بات خواہ کتنی ہی مضحکہ خیز کیوں نہ ہو، لیکن ہے حقیقت کہ اقوامِ متحدہ میں چین کی نمائندگی کا حق چین کی موجودہ حکومت کو نہیں، جو اتفاق سے کمیونسٹ واقع ہوئی ہے بلکہ چیانگ کائی شیک کی حکومت کو ہے جو سارے چین سے پسپا ہو کر معمولی سے جزیرہ فارموسا میں امریکہ کی پشت پناہی سے باقی رہ گئی ہے۔ روس اس چین کو رکن بنا کر اپنے ووٹوں میں ایک کا اضافہ کرنا چاہتا ہے، لیکن امریکہ اپنے ووٹ سے دستکش نہیں ہونا چاہتا۔ چنانچہ جب کوریا کا معاملہ اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کے خصوصی اجلاس میں پیش ہوا تو سب سے پہلے یہی بات طے ہوئی کہ مذاکراتِ صلح کا چین کی نمائندگی سے کوئی تعلق نہیں، لہٰذا اسے زیرِ بحث نہیں لایا جا سکتا۔ بظاہر اقوامِ مغرب کا یہ استدلال صحیح ہے لیکن اس روش سے بہت سی پیچیدگیوں کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ مثلاً اب جب چین کی فوجیں کوریا کی جنگ سے فارغ ہوگئی ہیں، تو ایشیا کے کئی ملکوں کو خطرہ پیدا ہوگیا ہے کہ چین ان میں مداخلت کرے گا۔ اس وقت ہند چینی میں کمیونسٹ جنگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں اور اس ملک کا اچھا خاصا حصہ ان کے قبضے میں ہے۔ پچھلے دنوں موسمِ برسات سے چند دن پہلے یہ آگ دفعتہً ایسی بھڑک اٹھی تھی کہ تمام جنوبی ایشیا کو فوری خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔ اس ملک کی سرحدیں چین سے ملتی ہیں اور بڑی آسانی سے چینی کمک پہنچ سکتی ہے۔ کوریا کی صلح کے بعد ہند چینی کا مسئلہ نازک ہوگیا ہے۔ چنانچہ امریکہ کے سکرٹری آف سٹیٹ نے حال ہی میں اس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ ہند چینی دوسرا کوریا بن سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ چین کو تسلیم نہ کیا گیا تو وہ اس قسم کے فتنے پیدا کرے گا۔ ہند چینی کا معاملہ کوریا سے کہیں نازک اور سنگین ہے۔ اس میں کمیونسٹ اثر بڑھ گیا تو تھائی لینڈ (سیام)، برما اور ملایا سب کی حالت مخدوش ہو جائے گی۔ اس لئے ہند چینی کو بآسانی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

سیاسی کانفرنس کی تشکیل | جہاں تک کوریا کا تعلق ہے اس کے تضمنات کا تصفیہ کرنے کیلئے ایک سیاسی کانفرنس مرتب

ہوگی جو نوے دنوں کے اندر اندر تمام کام ختم کر دے گی۔ سوال یہ ہے کہ کیا تمام متنازع فیہ امور اس معینہ مدت میں حل ہو جائیں گے؟ بظاہر اس کی کوئی توقع نہیں۔ مغربی کوریا کے صدر سنگمن ری نے دھمکی دی ہے کہ تین ماہ کے بعد وہ لڑائی شروع کر دیں گے۔ امریکہ نے اعلان کیا ہے کہ اگر تین ماہ میں کوئی تصفیہ نہ ہو سکا تو وہ کانفرنس سے قطع تعلق کر لے گا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ امریکہ اس کے بعد لڑائی کی طرح ڈال دیگا گو سنگمن ری نے اس سے یہی استنباط کرنا چاہا ہے۔

ابھی سیاسی کانفرنس کی ترتیب و تشکیل کا معاملہ زیرِ غور ہے۔ جنرل اسمبلی کے خصوصی اجلاس میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ کانفرنس کے ارکان وہی سولہ اقوام ہوں جنھوں نے کوریا میں اقوام متحدہ کے فیصلے کے مطابق فوجیں بھیجیں۔ اس معیار کے مطابق روس کانفرنس میں شریک نہیں ہو سکتا۔ کمیونسٹ ممالک نے ہندوستان کو اپنا بہی خواہ سمجھتے ہوئے یہ بھی کوشش کی کہ کسی طرح وہ اس کانفرنس میں شریک ہو جائے۔ خود ہندوستان نے ایڑی چوٹی تک کا زور لگا دیا کہ وہ اس بین الاقوامی کانفرنس میں شریک ہو کر ثالث کی حیثیت اختیار کر لے اور اپنی صلح جوئی اور امن پسندی کی داد طلب کر لے۔ (ضمناً یہ بھاگ دوڑ ہو ہی رہی تھی کہ کشمیر میں عبداللہ کی برطرفی نے دنیا بھر میں ہندوستان کیلئے روسیاہی کا سامان مہیا کر دیا۔ یہ موقع تھا کہ ہندوستان کے عزائم کا تار و پود بکھر جاتا، لیکن وزیر اعظم پاکستان کے سفرِ دہلی نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا اور ہندوستان کی ساکھ پھر قائم ہو گئی) امریکہ نے ہندوستان کی بہت مخالفت کی حتیٰ کہ آخر کار ہندوستان کو اپنی روش بدلنا پڑی اور مطالبہ شرکت سے دستکش ہونا پڑا۔ اسمبلی نے متعلقہ قرارداد چین کو بھیجی اور امریکہ کو یہ اختیار بھی دیا کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ ۲۸ اکتوبر تک سیاسی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آجائے۔

چین نے اس فیصلہ کی مخالفت کی ہے اور اپنی طرف سے یہ تجویز بھیجی ہے کہ کانفرنس میں پانچ ارکان کا اور اضافہ کیا جائے۔ وہ پانچ ارکان یہ ہیں: روس، پاکستان، ہندوستان، انڈونیشیا اور برما۔ اقوام مغرب میں سے اب تک امریکہ اور فرانس اس تجویز کو مسترد کر چکے ہیں۔ برطانیہ نے تاحال جواب نہیں دیا تاہم برطانوی حلقوں میں اسے مایوس کن کہا گیا ہے۔ پاکستان کے "سیاسی" حلقوں نے ضرورت سے زیادہ عجلت سے کام لیتے ہوئے یہ اعلان کر دیا ہے کہ پاکستان کو یہ تجویز منظور نہیں۔

سیاست کا نیا رُخ

بین الاقوامی سیاست میں اگست کے مہینے میں ایک نیا موڑ آیا ہے۔ ۸ اگست کو روس کے وزیر اعظم مالنکوف نے اعلان کیا کہ روس نے بھی ہائیڈروجن بم بنا لیا ہے۔ گو ابتداءً اس اعلان کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی لیکن ایک آدھ روز میں ہی امریکہ کے سائنسدانوں نے یہ تصدیق کر دی کہ روس میں ایسے دھماکے ضرور ہوئے ہیں جو ہائیڈروجن بم یا اس سے متعلق ہو سکتے ہیں۔ ہائیڈروجن بم کی ہلاکت آفرینی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسے "پھٹانے" کے لئے ایٹم بم کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ ۶ اگست ۱۹۴۵ء کو امریکہ نے ہیروشیما (جاپان) پر پہلا ایٹم بم پھینکا۔ ۲۳ ستمبر ۱۹۴۹ء کو صدر ٹرومین نے اعلان کیا کہ ایسی شہادت موجود ہے کہ انہی دنوں روس نے ایٹم بم "پھٹانے" کا تجربہ کیا۔ ۱۶ نومبر ۱۹۵۲ء کو امریکہ نے پہلا آزمائشی ہائیڈروجن بم چلایا۔ اس کے بعد ایک سال کے دوران میں روس نے یہی بم بنا لینے میں کامیابی کا اعلان کیا اور امریکہ نے اعتراف کیا کہ دعویٰ مبنی بر حقیقت ہے۔

روس نے یہ اعلان ایسے وقت کیا جبکہ اس سے متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جا رہا تھا کہ اس میں انحطاط و اضمحلال کے آثار ہویدا ہو رہے ہیں۔ بیریا کا زوال اور مشرقی جرمنی اور مشرقی یورپ کے علاقوں میں شورش اور ہنگامے یقیناً اس کا بین ثبوت تھے۔ الغرض ملنکوف نے اپنی تقریر میں اس غلط فہمی کو بھی رفع کرنے کی کوشش کی۔ اس اعلان نے بین الاقوامی سیاست کو نئی راہ پر ڈال دیا ہے۔ اب امریکہ تنہا ایٹمی توانائی کا مالک نہیں، نہ وہ حدودِ جنگ سے باہر رہ سکتا ہے۔ روس انہی اسلحہ سے مسلح ہے جو امریکہ کے پاس ہیں۔ اب دو ایسی طاقتیں آمنے سامنے ہیں جو خطرناک ترین اسلحہ کی مالک ہیں۔ کیا وہ دونوں اسی زور میں ایک دوسرے سے متصادم ہو جائیں گی یا ان کے مابین تصادم باہمی خوف کی وجہ سے دور کی بات ہو گیا ہے؟ اس کا جواب وقت دے گا۔

ایران کا خلفشار

ایران کے حالات نے حیرت انگیز پلٹا لیا ہے۔ اس میں ایران کا کس حد تک بھلا ہو گا اور اس کے مصائب کا کیا حل نکلے گا؟ اس کے متعلق فی الوقت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ڈاکٹر مصدق نے مجلس کے تعطل کو توڑنے کیلئے یہ مطالبہ کیا کہ ملک بھر میں استصوابِ رائے کیا جائے اور مجلس کو توڑ دیا جائے۔ انھوں نے مخالفت کے علی الرغم استصواب کرایا اور اس کا نتیجہ ان کے حق میں نکلا، یہانتک کہ ننانوے فی صدی سے اوپر آراء ان کے حق میں تھیں۔ اس فیصلہ کے مطابق مجلس کو توڑ دیا گیا لیکن شاہ ایران مصدق کو آمر بنتا نہ دیکھ سکے۔ انھوں نے ڈاکٹر مصدق کو برطرف کر دیا اور جنرل زاہدی کو وزیر اعظم مقرر کر دیا اور خود ایران سے فرار ہو گئے۔ چنانچہ ڈاکٹر مصدق کی برطرفی اور جنرل زاہدی کے تقرر کا علم شاہ ایران کے ایک بیان سے ہوا جو انھوں نے بغداد میں جا کر دیا۔ دو دن تک مصدق ایران کی صورت حال کے مالک رہے، لیکن پھر یکایک حالات بدل گئے۔ جنرل زاہدی جو روپوش ہو گئے تھے، ایران پر قابض ہو گئے اور مصدق کو گرفتار کر لیا۔ اس پر شاہ ایران فاتحانہ انداز سے واپس آگئے اور جہاں ایک طرف ملوکیت کے خاتمے کی خبریں اڑ رہی تھیں وہاں دو ہی دنوں میں ملوکیت کا پھر سے دور دورہ ہو گیا۔ اس غیر متوقع تبدیلی پر برطانیہ اور امریکہ نے خوشی کے شادیانے بجائے۔ ویسے قرائن و آثار سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ان دونوں طاقتوں کا مصدق کے زوال میں بڑا ہاتھ ہے۔ کم از کم دونوں کی کوشش یہ ہے کہ یہ نئی صورت حال قائم رہے کیونکہ اس کی پالیسی کا رخ مغرب کی طرف ہے اور یہی امریکہ اور برطانیہ کا مقصد ہے۔

مصدق کے زوال کے فوراً بعد ہی ایران نے امریکہ سے استمداد کی۔ شاہ نے ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ ایران کو فوراً مالی امداد چاہیئے۔ جنرل زاہدی نے اس کے مطابق مذاکرات شروع کئے اور بالآخر امریکہ نے اندازاً سوا دو کروڑ ڈالر کی امداد منظور کر دی۔ یہ امداد ایران کے معاشی تعطل کو دور کر سکے گی یا نہیں، یہ دیکھا جائے گا لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایران میں ابھی امن و سکون پیدا نہیں ہوا اور وہ وحدتِ قومی مفقود ہے جو ایسے مہیب بحران میں دلیل کامیابی بنتی ہے۔ ایران کا سب سے بڑا خطرہ تو وہ پارٹی ہے جو منظم کمیونسٹ جماعت ہے اور ہنگامے پیدا کرنے اور فتنے اٹھانے میں ید طولیٰ رکھتی ہے۔ اس کا فائدہ ہنگامہ زائی اور فتنہ پروری میں ہی ہے۔ تازہ ہیجان میں اس نے عنانِ اقتدار سنبھالنے کی پوری کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکی۔ بحالات موجودہ یہی ایک پارٹی مستقبل کی حکمران نظر آتی ہے۔ اس نے پہلو بدل بدل کر نئی حکومت کی مخالفت کی ہے اور اسے "غیر قانونی" تک کہا ہے۔ ایران کوریا بنتا جا رہا ہے

اس کے نتائج ایران کے لئے ہی نہیں بلکہ جملہ عالم اسلامی کے لئے۔ خصوصاً پاکستان کیلئے جو ایران کا قریبی ہمسایہ ہے۔ نہایت دوررس ہوں گے۔

مصر کا ہیجان

ایران کی طرح مصر بھی سازشی عناصر کی توجہ کا مرکز بن رہا ہے۔ حال ہی میں جنرل نجیب نے یہ انکشاف کیا ہے کہ بعض مصری غدار غیر ملکی استعمار پسندوں سے مل کر ان کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کر رہے تھے۔ ایک سرکاری اعلان میں بتایا گیا کہ ایسے شواہد موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ غیر ملکی فتنہ پروروں نے دو لاکھ مصری پونڈ ملکی غداروں کو رشوت دینے اور اپنے ساتھ ملانے پر صرف کئے۔ ایسے غداروں کے لئے خصوصی ٹریبونل قائم کیا جا رہا ہے جو ان کے مقدمات فیصل کرے گا۔

گو اس سازش کی تفصیلات منظر عام پر نہیں آئیں، نہ ان ناموں کا اعلان ہوا جو اس میں شریک ہوئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ایسی سازش قابل فہم ہے۔ جنرل نجیب کی حکومت نے ابھی تک برطانیہ سے مفاہمت نہیں کی اور اس پر مصر ہے کہ نہر سویز سے برطانیہ کو نکلنا ہوگا۔ اس سے کم پر مصر کی رضامندی حاصل کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ مصر اسی ہزار (۸۰،۰۰۰) برطانویوں میں سے جو نہر سویز کے علاقے میں ہیں، چار ہزار (۴،۰۰۰) ماہرین کو اپنا ملازم بنا کر رکھنے پر تیار ہے، لیکن برطانیہ انھیں مصر کا ملازم نہیں بلکہ برطانیہ کا ملازم بنا کر رکھنا چاہتا ہے تاکہ آویزش کی جو موجودہ صورت ہے وہ چھوٹے پیمانے پر ہی، باقی رہے اور برطانیہ کو بعد میں مداخلت کرنے کا آسان بہانہ مل سکے۔ مصر نہ اس شرط کو قبول کرنے پر آمادہ ہے نہ سویز کے دفاع کو بین الاقوامی دفاع (جو دراصل برطانوی دفاع کا دوسرا نام ہے) تسلیم کرنے پر تیار ہے۔ وہ اس دفاع کو عربوں تک محدود رکھنا چاہتا ہے اور اس کے لئے تیار ہے کہ بوقت ضرورت اقوام مغرب سے استمداد کر لی جائے۔ امریکہ کی پوزیشن اس قضیہ میں عجیب ہے۔ وہ نہ مصر کے مطالبات کو رد کر سکتا ہے اور نہ برطانیہ کی ہمدردی سے دستکش ہو سکتا ہے۔ آخر الذکر کی ہمدردی اس کے لئے بہر حال مقدم ہے۔ ان رجحانات کے پیش نظر یہ قیاس کرنا مشکل نہیں کہ باہر سے تاریں ہلائی جائیں اور جنرل نجیب کے خلاف شورش بپا کی جائے کیونکہ وہ بھی مصدق کی طرح مغرب کے استعمار سے گلو خلاصی چاہتے ہیں۔ بدقسمتی سے مغرب اس کی تاویل کرتا ہے کہ جو اقوام اس کے استعمار کے چنگل سے نکلنا چاہتی ہیں وہ لامحالہ کمیونسٹ روس کے زیر اقتدار ہو جائیں گی، حالانکہ مغربی اقوام چاہیں تو اپنی حکمت عملی پر نظر ثانی کر کے مسلم اقوام کی ہمدردی اور عملی امداد حاصل کر سکتی ہیں۔ مغرب ابھی تک اس نکتہ کو عملی سیاست کا محور نہیں بنا سکا اور اقوام مسلم اتنی کمزور اور غیر متحد ہیں کہ وہ ان کی ریشہ دوانیوں کی آسان شکار گاہیں بن گئی ہیں۔ یہ ایک اور وجہ ہے جس سے مغرب کے نقطۂ نگاہ میں صحیح تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ جب وہ اور ذریعے سے ان اقوام کو استعمال کر سکتی ہیں اور مطلب براری کی صورت پیدا کر سکتی ہیں تو پھر ان کو مراعات دے کر ان کی دوستی خریدنے سے کیا فائدہ! مسلم اقوام بھی ابھی اس نکتہ سے بے خبر ہیں۔

نہر سویز کے مسئلہ نے اقوام مغرب کے سامنے یہ تصور پیش کیا کہ مشرق وسطیٰ میں بھی ایک دفاعی کمان قائم کی جائے جسے شمالی اوقیانوس کی حلیف طاقتوں کی دفاعی کمان (NATO) سے منسلک کیا جائے۔ یہ دفاعی کمان جسے M.E.D.O. میڈو کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اب تک معرضِ وجود میں اس لئے نہیں آسکی کہ مصر اس میں شرکت کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ برطانیہ کے انخلاء کے بعد ہی ایسی کمان میں شرکت کا سوال اٹھانا چاہتا تھا۔ اس سال کے شروع میں امریکہ نے اس میڈو کو وسیع کرکے پاکستان کو بھی اس میں شریک کرنا چاہا۔ اس میں ہندوستان کو عالم اسلامی کے اتحاد کے سامان نظر آئے۔ چنانچہ اس نے اس قدر اس کی مخالفت کی کہ بالآخر امریکہ کو اس خیال سے دستکش ہونا پڑا۔ حال ہی میں مسٹر جان فاسٹر ڈلیز نے اعلان کیا ہے کہ یہ منصوبہ ناقابل عمل ہے۔ یہ دراصل پاکستان کی خارجی پالیسی کی شکست ہے۔

مغربی استعمار مصر کے آگے شمالی افریقہ میں پھر برطانیہ اور فرانس مسلمانوں کی گھات میں ہیں۔ مصر کے تنازع اور تعطل کے پیش نظر برطانیہ مصر کے ہمسایہ ملک لیبیا میں اپنے پنجے مضبوطی سے گاڑ رہا ہے تاکہ اگر سویز کو اسے چھوڑنا پڑا تو متبادل اڈہ اس کیلئے موجود ہو۔ لیبیا یوں تو عرب لیگ میں بھی شامل کر لیا گیا ہے، لیکن اس کی افادی حیثیت رکنیت سے بڑھ کر کچھ نہیں حال ہی میں برطانیہ اور لیبیا کا معاہدہ ہوا ہے جس کی میعاد بیس سال تک کی ہے۔ اس معاہدہ کی رو سے برطانیہ لیبیا کے فوجی اڈے استعمال کرے گا اور اس کے معاوضہ میں ایک لاکھ پونڈ سالانہ ادا کرے گا۔ مصر میں اس معاہدے پر کافی تنقید کی گئی ہے لیکن اس کا کیا جواب ہے کہ عند الضرورت مدد ملتی ہے تو استعماری قوتوں کی طرف سے ملتی ہے نہ کہ ان ہمسایوں کی طرف سے جو اس مدد کی مخالفت کرتے ہیں لیکن عملاً کسی قسم کی مدد دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اگر مسلمان ممالک مصیبت میں ایک دوسرے کے کام آنا سیکھیں تو عالم اسلامی کی بہت سی مشکلات آنِ واحد میں حل ہو جائیں۔

یہیں سے متصل تیونس اور مراکو میں فرانس خونیں پنجے گاڑ رہا ہے۔ اس نے حال ہی میں مراکو کے سلطان کو معزول کرکے صوبہ مراقش کے بربر سلطان کو تمام مراکو کا سلطان مقرر کر دیا ہے۔ سلطان مراکو کی معزولی کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ عوام کے مطالبہ آزادی کا موید تھا اور ان "اصلاحات" کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوا جو فرانس اپنی طرف سے عطا کرنا چاہتا تھا۔ مراکو میں یہ سب کچھ ہوا لیکن اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے اس مسئلہ کو زیر بحث لانے سے انکار کر دیا کیونکہ فرانس کے کہنے کے مطابق یہ خانگی معاملات بین الاقوامی مجالس میں زیر بحث نہیں لائے جا سکتے۔ برطانیہ نے بھی فرانس کی تائید کی اور امریکہ نے بھی مصلحت اسی میں سمجھی۔ شاید یہ مسئلہ جنرل اسمبلی کے ایجنڈے میں شریک ہو سکے۔ لیکن بقول اقبال

تیری دوا نہ جینوا میں ہے نہ لندن میں

کیونکہ

سنی ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات　　خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے

لیکن ابھی مسلمان خودی کی منزل سے کوسوں دور ہے!

اندرونِ خانہ پاکستان کی سیاست میں دو نہایت اہم واقعات کشمیر اور آئین ہیں۔ یہ دونوں ایشوع اب ایسی نوعیت اختیار کر چکے ہیں کہ پاکستان کے مستقبل کا دارومدار انہی پر ہے۔ کشمیر میں ہمالہ کے چشمے ابلے اور

خوب اُبلے۔ مگر پاکستان وُلر کے کنارے سوچتا رہا[1] اور بات کہیں سے کہیں جا پہنچی۔ ۹ اگست کو ریاست کشمیر کے حکمران نے شیخ عبداللہ کو برخاست کرکے گرفتار کر لیا اور اس کے بجائے بخشی غلام محمد کو وزیراعظم مقرر کر دیا۔ عبداللہ پر الزام یہ تھا کہ وہ ہندوستان کے ساتھ الحاق کا حامی نہیں رہا بلکہ آزاد کشمیر کے خواب دیکھ رہا تھا۔ کچھ عرصہ سے عبداللہ نے اپنی تقاریر میں نمایاں طور پر ہندوستان کی مخالفت شروع کر دی تھی اور کہنا شروع کر دیا تھا کہ ہندوستان کے رویے کے پیش نظر وہ ریاست کے مسلمانوں کو ہندوستان سے الحاق کرنے پر راضی نہیں کر سکتا۔ عبداللہ کے اس استدلال سے ہندوستان کے دعوے کی بنیاد ہی باطل ہو گئی تھی۔ ہندوستان کشمیر کو دو وجوہات کی بنا پر اپنا حصہ سمجھتا تھا۔ ایک یہ کہ وہاں کے مہاراجہ نے اس سے الحاق کر لیا ہے اور دوسرے یہ کہ عبداللہ کشمیر کا نمائندہ ہے اور وہ کلیتہً ہندوستان کے ساتھ ہے۔ چھ سال تک ہندوستان ساری دنیا میں عبداللہ کا ڈھول پیٹ رہا تھا۔ عبداللہ پاکستان کے خلاف ہندوستان کی سب سے بڑی دلیل تھا۔ آج وہی عبداللہ ہندوستان سے الحاق کے خلاف ہو گیا تھا۔ [اتفاق سے یہ واقعہ ایسے وقت ہوا جبکہ ہندوستان، بین الاقوامی سیاست میں ثالث کا مقام مفتخر حاصل کرنے کے لئے امکانی کوششیں صرف کر رہا تھا۔] ان حالات میں عبداللہ کو اسی شدت اور بے پناہی کے ساتھ ہندوستان کے خلاف استعمال کیا جا سکتا تھا جیسا کہ ہندوستان اسے ہمارے خلاف استعمال کرتا چلا آ رہا تھا۔ لیکن ہمارے غلط بیں سیاست دانوں نے یہ نادر موقع ہاتھ سے کھو دیا۔ نہرو اتنا بڑا صدمہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا تھا لیکن ہم نے اسے اس قابل بنا دیا کہ وہ دنیا میں پھر سے اپنا وقار قائم کر لے۔

ہماری خارجی پالیسی کی یہ ایک اور بڑی ناکامی ہے۔ ہمارے وزیراعظم نے ازرہ صلح جوئی نہرو سے ملاقات کی اور جو کچھ اس نے کہا اس پر بلا چون و چرا صاد کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ جو تصفیہ دہلی میں ہوا اس سے بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ دونوں وزرائے اعظم کے باہمی مذاکرات کے بعد جو مشترکہ اعلامیہ شائع ہوا اس میں کہیں اقوام متحدہ کا ذکر نہیں تھا جن کے ذریعہ گذشتہ پانچ سال سے کشمیر کا مسئلہ حل کیا جا رہا تھا۔ اس میں پنڈت نہرو نے ازرہ کرم یہ تسلیم کیا کہ وہ آزاد استصواب رائے کے ذریعے کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کرینگے نیز ایڈمرل نمٹز کے بجائے کوئی اور ناظم استصواب ——— اپریل ۱۹۵۴ء سے پہلے پہلے ——— مقرر کریں گے جو بڑی طاقتوں میں سے نہیں ہو گا۔

اس اعلامیہ پر عمل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کشمیر میں عبداللہ کے بعد جو قتل و غارت ہوا اور ہو رہا ہے وہ صحیح ہے۔ نیز مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ سے واپس لے لیا جائے اور باہمی طور پر حل کیا جائے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ نہرو جو اقوام متحدہ کے اخلاقی دباؤ کے باوجود پانچ سال تک استصواب رائے کی تفصیلات پر راضی نہیں ہو سکا اب اقوام متحدہ کے دباؤ سے محفوظ ہو کر کیسے پاکستان سے مفاہمت کر لے گا۔ اور کشمیر اس کے حوالہ کر دے گا؟ تعجب ہے کہ کشمیر کے اس "قتل نامہ" کو بعض حلقوں میں سراہا بھی گیا ہے، حالانکہ اس نے کشمیر کے مسئلہ کو اور پیچیدہ بنا دیا ہے۔

ناظم استصواب کا استعفیٰ ادھر یہ ہو رہا تھا اُدھر ہندوستان نے اچانک یہ خبر مشہور کر دی کہ ایڈمرل نمٹز نے ناظم استصواب کے عہدے سے استعفا دے دیا ہے۔ گو اس استعفیٰ کی تصدیق نہیں ہوئی بلکہ اقوام متحدہ کی طرف سے

---

[1] ہمالہ کے چشمے ابلتے ہیں کب تک ۔ خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے (اقبال)

یہ اعلان بھی ہوا کہ استعفیٰ ان تک نہیں پہنچا۔ تاہم ہندوستانی اخبارات بدستور لکھ رہے ہیں کہ ایڈمرل نمٹز نے واقعی استعفا دیدیا ہے اور پاکستان کو عنقریب کفِ افسوس ملنا پڑے گا۔ کہا یہ جاتا ہے کہ استعفیٰ امریکی حکومت کے پاس ہے اور وہ اقوام متحدہ میں ابھی نہیں پہنچا۔ بظاہر یہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کیونکہ امریکہ نے کوریا کی سیاسی کانفرنس میں ہندوستان کی شرکت کی بہت مخالفت کی تھی اسلئے ہوسکتا ہے کہ ہندوستان کو خوش کرنے کیلئے اس نے نمٹز سے استعفیٰ دلوا دیا ہو کیونکہ ہندوستان امریکی ناظم کا مخالف تھا۔

اگر نمٹز نے استعفیٰ دیدیا ہے اور اس کے بجائے دونوں وزرائے اعظم کے مشترکہ اعلامیہ کے مطابق نئے ایشیائی ناظم کا انتخاب کیا جائیگا تو کہا نہیں جاسکتا کہ کسی ایک فرد پر دونوں ملکوں کا اتفاق ہوسکے۔ اگر ہو بھی جائے تو استصواب کی تفصیلات ابھی تک تصفیہ طلب ہیں۔ گذشتہ پانچ سال میں یہ تفصیلات محض اسلئے طے نہیں ہوسکیں کہ ہندوستان سلامتی کونسل کی تجاویز کے علی الرغم کشمیر سے اپنی فوجیں ہٹانے کیلئے تیار نہیں ہوتا تھا۔ اس نے بہ لطائف الحیل اس بین الاقوامی معاہدے کو عملی صورت دینے سے گریز کیا۔ تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ معاملہ سلامتی کونسل میں پیش نہ ہو، ناظم استصواب ایک کمزور ایشیائی قوم کا فرد ہو، ہندوستان پر اقوام متحدہ کا اخلاقی دباؤ بھی نہ ہو تو وہ استصواب کی تفاصیل پر کیسے راضی ہوجائے گا درآنحالیکہ وہ پانچ سال سے ان کو ناممکن العمل بناتا چلا آیا ہے؟ یوں بھی ہندوستان کو کوئی عجلت نہیں۔ کشمیر اس کے قبضے میں ہے۔ تاخیر اس کے لئے مفید ہے، اس لئے وہ تاخیر کرتا جارہا ہے اور جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے کشمیر ہمارے ہاتھ سے نکلتا جاتا ہے کیونکہ ہندوستان اپنے قدم مضبوطی سے جمارہا ہے۔

سب سے بڑا خطرہ کشمیر کے متعلق یہ ہے کہ جموں کا علاقہ جہاں مسلمانوں کی آبادی ۶۰ فیصدی تھی اب خالصۃً غیر مسلم علاقہ بن چکا ہے وہاں کے مسلمان کچھ قتل کردیئے گئے اور بقیہ نکال دیئے گئے ہیں۔ یہی حال وادی کشمیر کا ہوسکتا ہے۔ عبداللہ کے بعد جو قتل و غارت ہوا ہے اس کا اثر لامحالہ یہ ہوگا ـــ اور ہوا ـــ کہ مسلمان وہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ وہاں کی کیفیت یہ ہے کہ نیشنل کانفرنس جو برسر اقتدار پارٹی تھی، اس کے اکثر ارکان ان دنوں اس جرم کی پاداش میں جیلوں میں ہیں کہ وہ عبداللہ کے حامی ہیں۔ سرکاری ملازمتوں پر سے وسیع پیمانہ پر لوگوں کو اس جرم کی سزا میں ہٹایا جارہا ہے۔ بعض برخواست کرکے گرفتار کرلئے گئے ہیں۔ ان حالات میں اہل کشمیر پاکستان کی طرف ہجرت نہیں کرینگے تو اور کیا ہوگا۔ اور اس طرح اگر استصواب کا وقت آبھی گیا تو رائے دینے والوں کو کہاں کہاں سے جمع کیا جائے گا؟

آئین کی جنگ

پاکستان کا دوسرا مسئلہ آئین کا ہے۔ آئین کا معاملہ چھ سال سے معلق چلا آرہا ہے۔ اب یہ سوال آئین کا نہیں رہا بلکہ جنگ اقتدار کے گرداب میں آگیا ہے۔ اس گرداب کی تہ سے کیا ابھرتا ہے؟ یہ چند دنوں میں سامنے آجائیگا موجودہ حکومت جب سے قائم ہوئی، اس کے نمائندوں نے یہ کہنا شروع کردیا کہ ایک عبوری آئین کا مسودہ تیار ہورہا ہے جسے مجلس دستور ساز کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ عبوری کا لفظ غلط ہی نہیں افسوسناک بھی ہے۔ ہمارے ہاں پہلے ہی ایک عبوری قانون رائج ہے اور وہ ہے ۱۹۳۵ء کا انڈیا ایکٹ۔ اس میں وقتاً فوقتاً حسب ضرورت ترمیمات کرلی جاتی ہیں اور کام چلایا جارہا ہے۔ عبوری آئین وہی ہوتا ہے جو مستقل آئین کی تدوین سے پہلے استعمال ہوتا ہے۔ ایسا اس وقت ہورہا ہے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ ایک عبوری آئین کی بجائے دوسرا عبوری آئین رائج کیا جائے گا۔ بات درحقیقت یہ ہے کہ پاکستان کو جمہوریہ (ری پبلک) قرار دیئے جانے کا سوال زیر غور ہے۔

اور یہ عام طور پر مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ اپنے ملک کو نو آبادی کی بجائے جمہوریہ بنا دیا جائے۔ اگر یہ نہیں تو وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ جو مسودہ آئین (عبوری) پیش ہوگا وہ کیا ہے۔ اس کے باوجود جوں جوں مجلس دستور ساز کے اجلاس کا وقت (۲۳ ستمبر) قریب آتا جاتا ہے معاملہ عجیب نزاکت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ پچھلے دنوں صدر مجلس مولوی تمیز الدین صاحب نے یہ اعلان کیا کہ پاکستان کا آئین چھ ماہ میں تیار ہو سکتا ہے۔ تعجب ہے کہ صدر مجلس اپنے عہدے کے پاس خاطر سے اس نازک معاملہ میں خاموشی اختیار نہ کر سکے۔ محض یہی نہیں آپ نے اس کے بعد مشرقی بنگال مسلم لیگ اسمبلی پارٹی میں شرکت کی جس نے عبوری آئین کی شدید مذمت کی ـــ حالانکہ آپ کو پارٹیوں سے بلند ہونا چاہیے۔ اور پھر اس رویہ کی آپ نے حمایت کی۔ بہرحال مشرقی بنگال کی مسلم لیگ اسمبلی پارٹی نے ایک قرارداد میں مجلس دستور ساز کے تمام نمائندگان مشرقی پاکستان سے یہ سفارش کی کہ وہ عبوری آئین سے متعلق مسودہ کی مخالفت کریں خواہ اس کی جزئیات کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ انھوں نے مجلس دستور ساز سے یہ بھی مطالبہ کیا کہ بنیادی اصولوں کی رپورٹ نمبر ۲ ـــ جسے خواجہ ناظم الدین صاحب نے مجلس میں پیش تک نہیں کیا تھا اور وہ یونہی معرض التواء میں پڑ گئی تھی کی اساس پر نیا مسودہ آئین تیار کیا جائے۔ یہ قرارداد مقاصد اس کے باوجود پاس ہوئی کہ وزیر اعظم پاکستان نے نور الامین صاحب کو فون پر کہا کہ جب تک مسودہ سامنے نہیں آجاتا اس کی مخالفت کا فیصلہ نہ کیا جائے۔ نیز حکومت کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ عاجلانہ طور پر مسودہ منظور کر لیا جائے۔ بلکہ ہر شخص کو اس پر بحث اور رائے دہی کا حق دیا جائیگا۔

اب ۲۲ ستمبر کو مجلس دستور ساز کا اجلاس شروع ہو رہا ہے اس میں مشرقی پاکستان کے نمائندے (مسلمان اور ہندو) اس عزم کے ساتھ شریک ہو رہے ہیں کہ وہ پیش ہونے والے مسودہ آئین (عبوری) کی مخالفت کریں گے، بغیر یہ دیکھے کہ وہ مسودہ کیا ہے۔ اور وہ یہ مطالبہ کرینگے کہ مدفون رپورٹ کو نکال کر اس کے مطابق آئین بنایا جائے۔ پنجاب میں اس اقدام کی مذمت کی جا رہی ہے۔ گویا پھر سے بنگال اور پنجاب آمنے سامنے آرہے ہیں اور ملک صوبائی جنگ کے شعلوں کی لپیٹ میں آرہا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ خطرناک یہ ذہنیت ہے کہ نور الامین کی پارٹی نے محض مسلمان ارکان کو ہی نہیں بلکہ تمام نمائندگان صوبہ کو یہ اپیل کی کہ وہ آئین کی مخالفت کریں ـــ ہندوؤں کے ساتھ مل کر مجلس کے ۷۹ ارکان میں سے ان کی تعداد ۴۴ ہو جائے گی اور اس طرح وہ اکثریت کے مالک ہو جائیں گے۔ اور اس طرح "ہندو مسلم متحدہ قومیت" کا یہ محاذ اپنی مشترکہ تعداد کے زور پر پاکستان کی اسلامی مملکت کے آئین کے مسئلہ کا فیصلہ اپنے حق میں کرالے گا۔ وزیر اعظم محمد علی صاحب کو ان کی خواہشات کا احترام کس حد تک کرنا ہوگا، اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ انھیں بنگال کی تائید کی ضرورت ہے کیونکہ انھیں ابھی مجلس کی اسمبلی پارٹی کا لیڈر منتخب ہونا ہے۔ اس کا فیصلہ اجلاس سے پیشتر ہو جائے گا۔

انسان اور سیّارہ

بے راہ روی شیوۂ سیّارہ نہیں ہے
پھرتا ہے فلک پر مگر آوارہ نہیں ہے

اس کے لئے اک راہ مقرر ہے فضا میں
اس راہ پہ چلنے کے سوا چارہ نہیں ہے

ہر چند کہ ہے سامنے افلاک کی وسعت
حاصل اسے آزادئ طیارہ نہیں ہے

ہاں دیکھنا پڑتا ہے اسے ظلمتِ شب میں
وہ رنگ بھی جو درخورِ نظارہ نہیں ہے

اک دیدۂ بے خواب ہے لیکن نہیں بیتاب
سیّارہ کسی کا دلِ صد پارہ نہیں ہے

انساں کا سفر بھی ہے زماں اور مکاں میں
لیکن روشِ گردشِ سیّارہ نہیں ہے

آتی ہے رہِ زیست میں ہر دم نئی منزل
کوئی بھی مقام اس میں دگربارہ نہیں ہے

صد گونہ ہے انسان کی حرکت بھی سکوں بھی
یکساں صفتِ جُنبشِ گہوارہ نہیں ہے

انسان ہے رفتار میں کردار میں آزاد
پابستہ و بیچارہ و ناکارہ نہیں ہے

سیّارہ ہے روشن تر و بہتر ہے وہ انساں
ہوتے ہوئے آزاد جو آوارہ نہیں ہے

اسد ملتانی

باسمہ تعالیٰ

نزول عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کی حدیثوں کی تنقید

(علامہ تمنا عمادی)

(قسط ۳)

اس موضوع سے متعلق جتنی حدیثیں صحاح میں حضرت ابوہریرہؓ کی طرف منسوب ہیں ان کی تنقید گذشتہ دو قسطوں میں گذر چکی اب ان حدیثوں کے اسناد کی تنقید پیش کی جاتی ہے جو دوسرے صحابہ یا کسی خودساختہ صحابی کی طرف صحاح میں منسوب ہیں۔ مسلم، ترمذی، ابوداؤد اور ابن ماجہ میں کچھ حدیثیں نواس بن سمعانؓ نام کے ایک خودساختہ صحابی کی طرف منسوب کرکے روایت کی گئی ہیں۔ اس لئے پہلے ان خودساختہ صحابی نواس بن سمعان صاحب کا حال سن لیجئے۔ ان کا سلسلۂ نسب ابن حجر تہذیب التہذیب (ج ۱۰ ص ۴۸۰) میں نواس بن سمعان بن خالد بن عبداللہ بن ابی بکر بن کلاب لکھتے ہیں اور یہی استیعاب (ج ۱ ص ۳۱۱) میں ابن عبدالبر بھی لکھتے ہیں۔ وہ کلاب کے بعد ابن ربیعہ کا صرف اضافہ کرکے ایک نام آخر میں اور بڑھا دیتے ہیں اور اسد الغابہ (ج ۵ ص ۴۵) میں یوں ہے نواس بن سمعان بن خالد بن عمرو بن قرہ بن عبداللہ بن ابی بکر بن کلاب بن ربیعہ بن عامر بن صعصعہ یعنی ابن اثیر خالد اور عبداللہ کے درمیان دو نام عمرو، اور قرۃ بڑھاتے ہیں یعنی سمعان کے دادا ہی کے متعلق ائمہ رجال کا اختلاف ہے کہ عبداللہ ان کے دادا ہیں یا ان کے دادا کے دادا۔ ان کے وطن کے متعلق کچھ نہیں معلوم کہ یہ کہاں کے رہنے والے تھے۔ بس اسی قدر ائمہ رجال لکھتے ہیں کہ معدود فی الشامیین یعنی ملک شام کے رہنے والوں میں ان کا شمار ہے۔ مگر اس کا پتہ کوئی نہیں بتاتا کہ یہ شام کے قدیم باشندے تھے یا شام میں آکر بس گئے تھے۔ صرف نواس کا شمار شامیوں میں ہونے سے یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ ان کے باپ دادا بھی شامی ہی تھے۔ پھر شام کا علاقہ بہت وسیع تھا۔ اس کے کس شہر کس گاؤں کے رہنے والے تھے یہ آج تک کسی کو معلوم نہیں۔ ائمہ رجال لکھتے ہیں کہ نواس کے باپ سمعان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں حاضر ہوئے تھے (کہاں سے یہ نہ پوچھئے) آنحضرت صلعم نے ان کے لئے دعائے خیر کی۔ سمعان نے ایک جوڑہ نعلین تحفے کے طور پر پیش کیا۔ آپ نے قبول فرمالیا۔ اور انھوں نے اپنی بہن کو (جس کا نام آج تک کسی کو معلوم نہیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیاہ دیا۔ تو جب ان کی بہن آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئی تو تخلیہ کے وقت اس نے آنحضرت صلعم سے کہا کہ "اعوذ باللہ منک میں تم سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں" تو آپ نے اس کو چھوڑ دیا۔ اتنا کہہ کر ائمہ رجال لکھتے ہیں وہی کلابیہ یعنی یہی وہ کلابیہ عورت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس کلابیہ عورت کے متعلق یہ مشہور ہے کہ ... آنحضرت صلعم نے نکاح کیا تھا اور ملاقات کے وقت اس نے کہا تھا کہ "میں تم سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں" وہ یہی نواس کی پھوپھی، سمعان کی بہن اور خالد کی بیٹی تھی، گو اس کا نام کسی کو معلوم نہیں۔

تو اب دیکھئے کہ تاریخ و سیر کے آئمہ اس کے متعلق کیا لکھتے ہیں۔ تاریخ و سیر کے سب سے بڑے امام جو ابن اثیر (ولادت ۵۵۵ھ و وفات ۶۳۰ھ) صاحب اسد الغابہ اور ابن عبد البر (ولادت ۳۶۸ھ وفات ۴۶۳ھ) صاحب استیعاب دونوں سے بہت متقدم ہیں یعنی ابو جعفر محمد بن جریر الطبری (ولادت ۲۲۴ھ و وفات ۳۱۰ھ) کی کتاب "تاریخ الامم والملوک" جو تیسری صدی ہجری کی تصنیف ہے اس کی جلد سوم صفحہ ۱۷۵ ملاحظہ فرمایئے جس میں ازواج مطہرات کے اسمائے گرامی ترتیب وار لکھے ہیں۔ یعنی اس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے کس سے شادی کی، پھر ان کے بعد کن سے پھر ان کے بعد کن سے اس طرح لکھتے ہوئے ان کلابیہ عورتوں کے نام و نسب بتائے ہیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شادی کرنے کا بہتان بعض کوفی کذابوں نے باندھا ہے۔ تو اس سے قطع نظر کرکے کہ خود ابن جریر کیا ہیں اور از روئے روایت کیسے ہیں۔ اور یہ روایت وہ کس سے کر رہے ہیں اور جس سے وہ روایت کر رہے ہیں، وہ کس سے روایت کر رہا ہے، آپ ان کلابیہ عورتوں کے نام و نسب کو دیکھئے جن سے آنحضرت صلعم کے ازدواج کا ذکر کیا گیا ہے، اور صرف ابن جریر کی وجہ سے مورخین اسلام نے اس بہتان کو صحیح واقعہ قرار دیتے ہوئے اپنی کتابوں میں درج کر لیا ہے۔ تو ابن جریر حضرت میمونہ بنت حارث کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں کہ "پھر آنحضرت صلعم نے بنی کلاب بن ربیعہ کی ایک عورت سے نکاح کیا جس کا نام نشاۃ بنت رفاعہ تھا۔ اور اس کے متعلق اختلاف ہے۔ بعضوں نے اس عورت کا نام "سنا" بتایا ہے، اور اس کو سنا بنت اسماء بن الصلت السلمیہ کہا ہے۔ اور بعضوں نے کہا کہ وہ سنبا بنت اسماء بن الصلت تھی قبیلہ بنی سلیم کی ایک شاخ بنی حرام سے، اور لوگوں نے کہا کہ قبل اس کے کہ آنحضرت اس کے پاس داخل ہوں وہ وفات پا گئی اور بعضوں نے اس کا سلسلہ نسب سنا بنت الصلت بنت حبیب بن حارثہ بن ہلال بن حرام بن سمال بن عوف السلمی بتایا ہے۔

پھر آنحضرت صلعم نے نکاح کیا بنی ابی بکر بن کلاب کی ایک عورت عزیّہ بنت جابر سے۔ جس کے حسن و جمال کی خبر سنکر (نعوذ باللہ) آپ نے ابو اسید انصاری الساعدی کو اس کے پاس پیغام لے کر بھیجا تھا۔ ابھی اس کی کافرانہ زندگی کو تھوڑا ہی زمانہ گذرا تھا۔ جب آپ کے پاس آئی تو اس نے کہا کہ میں نے ابھی اپنے نفس سے پوچھا نہیں ہے۔ میں تم سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں، تو آپ نے فرمایا کہ یہ باز رہی ہے اللہ کی پناہ مانگتی ہوئی، اور آپ نے اس کو اس کے لوگوں کے پاس واپس کر دیا۔ ابن جریر لکھتے ہیں کہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ قبیلہ کندہ کی ایک عورت تھی۔ یہ ساری روایتیں ابن جریر نے ابن الکلبی سے اپنے شیوخ کی وساطت سے نقل کی ہیں، مگر پھر ابن الکلبی سے یہ بھی لکھتے ہیں کہ عزیہ[1]

---

[1] عزیہ بنت جابر ام شریک جن کا نام عزیلہ بعضوں نے لکھا ہے کہ یہی صحیح ہے۔ وہ ایک صحابیہ انصاریہ تھیں اور ایک ام شریک قرشیہ عامریہ بھی تھیں جن کا نام عزیّہ بنت ودان بن عوف کہا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان دونوں میں سے ایک نے آنحضرت صلعم کے پاس آکر اپنے نفس کا ہبہ کیا تھا۔ مگر اس کا ذکر نہیں کرتے کہ آپ نے قبول کیا یا رد کیا۔ اور کسی عورت کا نکاح کے بعد آپ سے یہ کہنا کہ میں آپ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں بالکل بعید از عقل ہے۔ نہ آپ بدصورت کریہہ منظر تھے، نہ بد اخلاق بدخو تھے۔ بلکہ آپ کے حسن خلق اور حسن صورت کا ہر طرف غلغلہ تھا۔ آپ پر بڑھاپے کا اثر بھی آنا نہ تھا کہ آپ سے تنفر پیدا ہو۔ غرض یہ کھلا ہوا افتراء ہے۔ اس قسم کی تمام روایتیں منافقین کی من گھڑت ہیں۔ انشاء اللہ ازواج مطہرات کے متعلق ایک مستقل مضمون جو کھلی قسط کی اشاعت کے بعد نذر ناظرین کیا جائے گا ۱۲ منہ غفرلہ۔

بنت جابر ام شریک تھی۔ اس کے پہلے شوہر سے ایک لڑکا تھا جس کا نام شریک تھا۔ اسی لئے یہ ام شریک کہی جاتی تھیں۔ پہلے شوہر کے بعد آنحضرت صلعم نے ان سے نکاح کیا تھا۔ مگر جب آنحضرتؐ ان کے پاس آئے تو ان کو سن رسیدہ پایا۔ اس لئے ان کو طلاق دیدی۔ حالانکہ یہ ایمان لا چکی تھیں، اور قریش کی عورتوں کے پاس جا جا کر اسلام کی تبلیغ کرتی تھیں اور ان عورتوں کو اسلام کی طرف بلاتی تھیں۔ کس قدر خلافِ عقل ہے کہ ایسی نیک کار، دین کی خدمت کرنے والی عورت کو صرف اس کے سن رسیدہ ہونے کی وجہ سے آپ طلاق دیدیں۔

اور پھر ابن جریر لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلعم نے عمرہ بنت یزید سے بھی نکاح کیا تھا جو قبیلۂ بنی رؤاس بن کلاب سے تھیں۔

"تو نشاہ بنت رفاعہ یا سنا بنت اسمار بن الصلت یا سبا بنت اسمار بن الصلت یا سبا بنت الصلت۔ پھر غزیہ بنت جابر۔ پھر عمرہ بنت یزید۔ یہی وہ کلابیہ عورتیں ہیں جن کے بارے میں آنحضرت صلعم کے نکاح کرنے کا بہتان کلبی کوفی خبیث نے باندھا ہے اور اس کے اس بہتان کو ابن جریر نے اپنی کتاب میں درج کر کے ایک تاریخی واقعہ ثابت کیا ہے، اور ابن جریر سے دوسرے مؤرخین نے جس کو نقل کیا ہے ان کے فرضی نام یہی ہیں جو مذکور ہوئے مگر ان میں کوئی بھی اخت سمعان یا بنت خالد نہیں۔ پھر سمعان کی بہن کا ایک واقعہ گھڑ کر بیان کرنا اور وھی الکلابیۃ یعنی وہ کلابیہ جس سے آنحضرتؐ کے نکاح کا ذکر کیا جاتا ہے یہی ہے کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟

مختصر یہ ہے کہ سمعان اور سمعان کے بیٹے نوّاس، اور سمعان کی بہن کا نام جس کا نام جھٹلائے جانے کے ڈر سے بتایا نہ گیا یہ سب اہلِ شام کے من گھڑت اشخاص ہیں ورنہ در حقیقت ان ناموں کا کوئی مسمّٰی نہیں۔ اسی لیئے نہ نوّاس و سمعان کا صحیح وطن کسی نے بتایا، نہ یہ بتایا کہ سمعان آنحضرت صلعم کے حضور میں حاضر ہوئے تھے تو کہاں سے آئے تھے؟ نہ یہ کوئی لکھتا ہے کہ حضور میں حاضر ہونے کے بعد یہ مدینہ ہی میں رہے یا اپنے گھر واپس چلے گئے؟ اس حاضری کے وقت ان کے بیٹے نوّاس بھی ان کے ساتھ تھے، یا بعد کو آ کر مشرف باسلام ہوئے؟ یا ان سے پہلے ہی اسلام لا چکے تھے؟ یا پھر وہ نواس مدینہ ہی میں رہے یا گھر واپس چلے گئے؟ سمعان کی بہن کو آنحضرت صلعم نے چھوڑ دیا تو وہ کیا ہو گئی؟ مدینے میں رہی؟ مسلمان رہی؟ یا مرتد ہو گئی؟ اس نے کوئی دوسرا نکاح کیا، یا بے شوہر ہی کے رہ گئی؟ اور پھر حدیثوں کے سوا تاریخ کے کسی واقعے میں کہیں بھی نوّاس بن سمعان یا سمعان بن خالد کا کہیں نام نہیں آتا۔ اگر یہ لوگ واقعی کوئی شخص ہوتے تو تاریخ کے کسی واقعے میں تو کوئی ان کا ذکر کرتا۔ سمعان صاحب سے کوئی حدیث نہیں منسوب کی گئی۔ بلکہ ان کا بیٹا جس کو قرار دیا ہے یعنی نوّاس بن سمعان انھیں سے صحاح اور غیر صحاح میں کچھ حدیثیں ہیں۔ مگر شامیوں کے سوا اور کوئی بھی ان سے روایت نہیں کرتا۔ بلکہ ان سے روایت کرنے والے جن کو بتایا گیا ہے ان سے بھی شامی ہی لوگ ان کی حدیثیں روایت کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں نوّاس سے تنہا جُبیر بن نفیر الشامی ہی روایت کر رہے ہیں ان سے تنہا ان کے صاحبزادہ بلند اقبال عبدالرحمٰن بن جُبیر الشامی ہی فقط روایت کر رہے ہیں۔ اور ان سے صرف عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر الشامی روایت کر رہے ہیں کہیں بلاواسطہ اور کہیں بواسطۂ یحییٰ بن جابر الطائی، جو حمصی الشامی ہیں۔ اور عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر الشامی سے جو لوگ روایت کرتے ہیں وہ یا تو خراسانی ہیں یا شامی۔ اور آپ خراسان و شام و کوفہ و حمص وغیرہ مقامات سے پوری طرح واقف ہو چکے ہیں کہ جھوٹی حدیثیں گھڑنے والوں کے یہ مقامات خاص مرکز تھے۔ بہر حال سلسلے کی تین کڑیوں تک یہ حدیثیں آحاد در آحاد ہی رہیں۔ اس لیے

چوتھی اور پانچویں پشت سے جو تعدد طرق پیدا ہوا تو اس سے متابعت والی تقویت کا فائدہ نہیں حاصل کیا جا سکتا۔

عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر جو تنہا ذمہ دار راوی ان حدیثوں کے ہیں۔ وہ نہایت مجروح اور بالکل ناقابلِ اعتبار شخص ہیں۔ مگر ایسے موقع پر محدثین کرتے یہ ہیں کہ اس ایک شخص کو دو شخص قرار دیدیتے ہیں کنیت یا نسبت کا فرق پیدا کر کے یا دادا پردادا کسی کا نام بدل کر یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ جرحیں تو فلاں کے متعلق ہیں اور فلاں تو ثقہ ہے مجروح نہیں۔ جیسا کہ ابوجعفر احمد بن صالح المصری کو دو قرار دیکر ایک کے نام میں "شمومی" اور بعضوں نے شموئی (حافظہ بناشد) لگا کر جو غایت درجہ کریہہ جرحیں تھیں وہ شمومی یا شمونی کے سر تھوپ دیں، اور دوسرے کو ثقہ و معتبر قرار دیا کیونکہ ابوجعفر احمد بن صالح المصری امام بخاری کے شیوخ میں تھے۔ اسی طرح ابوجعفر محمد بن جریر بن یزید نے جو کتاب کھلم کھلا رافضی بن کر لکھی اس میں اس نے خود اپنے دادا کا مجوسی نام "رستم" لکھا اور جس کتاب میں اپنے رفض پر پردہ ڈالنا مقصود ہوا اس میں اپنے دادا کا اسلامی نام "یزید" لکھا تاکہ دونوں کے مصنف دو شخص سمجھے جائیں چنانچہ یہی ہوا کہ تاریخ و تفسیر تو ابن جریر بن یزید کی سمجھی جاتی ہے اور فارسی والی تاریخ طبری وغیرہ کسی دوسرے شخص کی تصنیف کہی جاتی ہے جو ابوجعفر محمد بن جریر بن رستم الطبری تھا۔ اور محدثین اہل سنت ابن یزید کو ہلکے درجے کا شیعہ اور ابن رستم کو کٹر رافضی لکھتے ہیں۔ حالانکہ دونوں ایک ہیں۔ اسی طرح حبّان بن علی العنزی اور ان کے بھائی مندل بن علی العنزی کو حِبّان یائے حطی سے اور مبدل بائے موحدہ سے اور عنزی نائے قرشت سے بنا کر فرق پیدا کر دیا ہے تاکہ وہ دونوں ان دونوں سے الگ دو اشخاص سمجھے جائیں۔ بالکل اسی طرح یہاں بھی عبدالرحمٰن بن جابر بن یزید کو دو شخص قرار دیدیا ہے۔ اور ایک کو تمیمی السلمی لکھ کر اس کو ان جرحوں کا مستحق قرار دیا ہے جو جرحیں متقدمین ائمہ رجال نے عبدالرحمٰن بن جابر بن یزید پر کی ہیں اور جس کے نام کو تمیمی کی قید سے آزاد رکھا ہے اس کو ثقہ قرار دیا ہے مگر اس کو کیا کیا جائے کہ باوجود اس کے تھوڑی بہت جرح کہ فلاں نے ان کو ضعیف کہا ہے۔ اور اہلِ کوفہ کے پاس انھوں نے بہت سی منکر حدیثیں روایت کیں اتنا ان کے متعلق بھی قلم سے نکل ہی گیا اور حقیقت یہ ہے کہ دونوں عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر ایک ہی ہیں اور متقدمین ائمہ رجال کی ساری جرحیں انھیں ایک کے متعلق ہیں اور یہی تنہا ان حدیثوں کے ذمہ دار ہیں جو نواس بن سمعان سے مسلم، ترمذی، ابوداؤد اور ابن ماجہ میں روایت کی گئی ہیں اور ان کے ساتھ مل کر دوسرے دو تین شامیوں، خراسانیوں نے نواس و سمعان کے نام گھڑے اور سمعان کی بہن کا ایک قصہ گھڑ کر اس کا بہتان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر باندھا۔ فسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔

نواس بن سمعان کے علاوہ ابوسریحہ حذیفہ بن اسید کی طرف بھی منسوب کر کے کچھ حدیثیں گھڑی گئی ہیں جن کے متعلق یہ ظاہر کیا گیا کہ ابوسریحہ سے ابوالطفیل روایت کرتے ہیں۔ صرف یہی حدیثیں نہیں، بلکہ ابوسریحہ کی ساری حدیثیں جو غالباً سات سے زیادہ نہیں ہیں، صرف ابوالطفیل الکوفی ہی ان سب کے تنہا راوی ہیں۔ اور ابوالطفیل سے ابوسریحہ کی حدیثیں بحصہ برابر باہم تقسیم کر کے تین عدد فرات القزاز روایت کرتے ہیں اور تین عدد قتادہ۔ ایک حدیث بچ رہی تھی وہ نصفا نصف تقسیم تو ہو نہیں سکتی تھی۔ ان

دونوں میں سے جو بھی لیتا اپنے حصے سے زیادہ لیتا۔ اسلئے اس ایک حدیث کی روایت کا ذمہ عمرو بن دینار نے لیکر ان دونوں کا جھگڑا چکا دیا۔ لیکن زیر بحث حدیثوں میں سے ایک حدیث کی ایک تحویل میں ایک صاحب اور بھی ابو طفیل سے روایت کرنے والے تیار ہو گئے اور وہ عبدالعزیز بن رفیع الاسدی ہیں جو طائف سے آکر کوفے میں بس گئے تھے ان کا ذکر ابھی آئے گا۔ مگر یہ اپنی اس تحویل کو ابو سریحہ ہی تک پہنچا کے رک گئے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچاتے۔ اس لئے دوسرے تین راویوں کے مقابلے میں یہ ابو الطفیل کے شاگرد ناقص ہیں۔ بہر حال حضرت ابو الطفیل جن کا نام عامر بن واثلہ تھا وفاتِ نبویؐ کے وقت زیادہ سے زیادہ آٹھ برس کے تھے اور حضرت علیؓ کے ساتھ کوفے میں رہتے تھے اور پھر کوفے ہی میں رہے۔ وفات مکے میں ہوئی۔ اور ابو سریحہ بھی کوفی ہی تھے اور وہیں وفات پائی۔ ابو سریحہ کا سال وفات کوئی نہیں لکھتا مگر ابو الطفیل صحابہ میں سے سب سے آخر میں وفات پانے والے تھے۔ ان کی وفات ۱۰۰ھ میں ہوئی اور ان کو شیعوں نے شیعہ بھی مشہور کیا ہے اہل سنت ائمہ رجال نے بھی ان کو تشیع لکھ دیا ہے۔ بہر حال ان دونوں سے یہاں روایت کرنے والے صرف فرات القزاز ہیں جو کوفی تھے اور ایک مجہول الحال آدمی ہیں نہ ان کا سال ولادت معلوم نہ سال وفات۔ یہاں تک کہ نہ ان پر کسی کی جرح ہے نہ تعدیل۔ چونکہ امام مسلم ان کی حدیث روایت کر رہے ہیں اس لئے دو تین کوفیوں نے ان کو صرف ثقۃٌ لکھ دیا اور بس۔ ان کی ایک حدیث میں ایک تحویل عبدالعزیز بن رفیع کی بھی بطور متابعت پیش کی گئی ہے۔ مگر یہ اسدی تھے طائف سے آکر کوفے میں بس گئے تھے اس لئے کوفی تھے اور ابن حبان نے ان کا ذکر ضعفا میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ بعض ایسی حدیثیں روایت کرتے ہیں جن کی متابعت نہیں ملتی۔ اور لکھتے ہیں کہ اٹکل پچو حدیثیں روایت کیا کرتے ہیں اسلئے سقط الاحتجاج بہ یعنی سند و حجت ہونے کے قابل نہ رہے اور علی بن الجنید نے کہا کہ یہ ضعیف تھے اور ان کی حدیثیں منکر ہیں اور جوزجانی نے کہا کہ یہ مرجیہ عقیدے میں غلو رکھتے ہیں اور ابن جریج ہی کے قول سے ان کے رافضی ہونے کا بھی پتہ چلتا ہے۔ دیکھئے تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۳۳۹۔ اور ابن ابی سطے نے بھی ان کا ذکر شیعوں میں کیا ہے۔ غرض یہ تو فرات القزاز سے بھی بدتر ہیں ان کی متابعت سے غریب قزاز کو کیا تقویت پہنچ سکتی ہے۔ محدثین کا اصول ہے کہ "اَدْوَنْ" یعنی راوی سے جو زیادہ ضعیف راوی ہو اس کی متابعت سے کوئی تقویت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور پھر شعبہ جو قزاز سے بھی روایت کر رہے ہیں اور عبدالعزیز بن رفیع سے بھی وہ یہ کہتے ہیں کہ ابن رفیع نے اس حدیث کو مرفوع بنا کر روایت نہیں کیا ہے یعنی اس کو آنحضرت صلعم تک نہیں پہنچایا۔ اس حیثیت سے بھی یہ متابعت ناقص ہی ہے۔ غرض جس طرح نواس بن سمعان کی طرف منسوب حدیثوں کے ذمہ دار تنہا عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر الشامی ہیں اسی طرح ابو سریحہ حذیفہ بن اسید کی طرف منسوب حدیثوں کے ذمہ دار تنہا فرات القزاز الکوفی ہیں۔ بعد والے راویوں میں بھی متعدد افراد کافی مجروح ہیں۔ مگر اتنا جان لینے کے بعد، بعد والے راویوں پر بحث کر کے مضمون کو طول دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔

صرف مسلم میں ایک روایت حضرت جابر بن عبداللہ کی طرف منسوب کی گئی ہے جس کے متعلق دکھایا گیا ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ سے ابو الزبیر محمد بن مسلم بن تدرس الاسدی روایت کرتے ہیں جو معاملات میں بہت کھوٹے تھے اسی لئے امام شعبہ نے

ان سے روایت کرنا ترک کر دیا تھا اور ابو حاتم نے کہا کہ یکتب حدیثہ ولا یحتج بہ ان کی حدیث لکھ لی جائے گی مگر وہ سند حجت نہیں سمجھی جائے گی۔ اور ابو الزبیر سے ابن جریج عبدالملک بن عبدالعزیز روایت کرتے ہیں جو کسی اموی کے غلام آزاد کردہ تھے اور رومی الاصل تھے۔ نہایت مشہور مدلس تھے اور نہایت بری خطرناک تدلیس کیا کرتے تھے۔ ستر عورتوں سے انھوں نے متعہ کیا تھا۔ مُنکَر حدیثیں بہت روایت کیا کرتے تھے۔ یہ مجروح راویوں سے حدیثیں لیتے تھے اور ان کے ناموں میں اس طرح تدلیس کرتے تھے کہ معلوم نہ ہو کہ کس سے روایت کر رہے ہیں یا اس کی جگہ کسی ثقہ کا نام رکھ دیتے تھے۔ یقین ہے کہ اس حدیث کو بھی ابن جریج ہی نے کسی سخت مجروح وضعیف راوی سے سن کر ابو الزبیر کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ یا خود گھڑ لیا ہو۔ کیونکہ ان کا مذہب ان کے ستر عورتوں سے متعہ کرنے سے خود ظاہر ہے۔

اسی طرح ایک حدیث اور صرف مسلم میں ہے جو حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی طرف منسوب ہے جس کو ایک مجہول الحال یعقوب بن عاصم بن عروہ بن مسعود روایت کرتے ہیں۔ نہ جن کا وطن معلوم ہے نہ سال ولادت و وفات کا کہیں ذکر ہے، نہ کوئی ان پر جرح کرتا ہے نہ ان کی تعدیل کرتا ہے۔ چونکہ ان کی حدیث مسلم میں ہے اس لئے مسلم کا بھرم رکھنے کے لئے صرف ابن حبان نے ان کا ذکر ثقات میں کر دیا ہے۔ اسی طرح ان سے جو صاحب اس حدیث کو روایت کر رہے ہیں نعمان بن سالم، ان کا بھی کچھ حال معلوم نہیں بالکل مجہول ہیں، نہ ان کا سالِ ولادت معلوم نہ سالِ وفات، نہ نسب معلوم، نہ یہ معلوم کہ کس قبیلے کے تھے۔ پھر اس میں بھی ائمہ رجال کا اختلاف ہے کہ یہ کس "سالم" کے بیٹے ہیں جو ابنِ عمرؓ سے روایت کرتے ہیں یا کسی اور کے۔ علامہ مزی کہتے ہیں کہ انھیں سالم کے بیٹے ہیں۔ اور امام بخاری و ابن حجر کہتے ہیں کہ یہ کسی اور سالم کے بیٹے ہیں جن کا حال کچھ معلوم نہیں۔ پھر جرح و تعدیل کے قابل بھی کسی نے ان کو نہ سمجھا۔ مگر شعبہ ان سے روایت کرتے ہیں اور ائمہ رجال نے یہ فرض کر لیا ہے کہ شعبہ جس سے روایت کریں وہ ضرور ثقہ ہے۔ حالانکہ ہم نے اپنی کتاب "تراجم المفترین" میں شعبہ کے سو سے زیادہ شیوخ کے نام گن کر لکھ دیئے ہیں جن پر ائمہ رجال کی کم و بیش جرحیں موجود ہیں۔ اور نعمان بن سالم جیسے مجہول الحال راویوں سے تو یہ بہت روایت کرتے ہیں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ مسلسل یہ دو دو مجہول الحال استاد و شاگرد کی روایت صرف شعبہ کا بھرم رکھنے کے لئے صحیح تسلیم کر لی جائے۔ خصوصاً جب اس کے آخری راوی عبیداللہ بن معاذ بن نصر البصری جن سے امام مسلم روایت کر رہے ہیں ان کے متعلق یحییٰ بن معین نے صاف کہہ دیا کہ لیس من اصحاب الحدیث۔ لیس بشیٔ۔ یعنی یہ حدیث جاننے والوں میں سے نہیں ہیں، یہ کچھ بھی نہیں ہیں۔ جو خود کچھ بھی نہیں، اس کی حدیث بھی کچھ بھی نہیں۔

اور صرف ترمذی میں ایک حدیث ابن شہاب زہری ہی تنہا عبیداللہ بن عبداللہ بن ثعلبہ الانصاری سے اور وہ صرف عبدالرحمٰن بن یزید بن جاریہ الانصاری سے روایت کرتے ہیں۔ عبیداللہ بن عبداللہ بن ثعلبہ الانصاری المدنی بالکل مجہول الحال شخص ہیں، کوئی عبداللہ بن عبیداللہ ان کو کہتا ہے کوئی کچھ اور کہتا ہے۔ حاکم نے ان کو عبیداللہ بن ثعلبہ بن صعیر لکھا ہے

جسکو ابن حجر غلط لکھتے ہیں۔ ان سے صرف ابن شہاب زہری ہی روایت کرتے ہیں اور یہ صرف عبدالرحمن بن یزید بن جاریہ الصاری سے اور وہ صرف اپنے چچا مجمع بن جاریہ انصاری صحابی سے، انھوں نے بھی عہد نبوی میں اپنے لئے قرآن جمع کر کے لکھ رکھا تھا۔ ان کے بھتیجے عبدالرحمن بن یزید بن جاریہ ان سے صرف یہی ایک حدیث روایت کرتے اور ان سے صرف عبیداللہ بن عبداللہ ثعلبہ جو ایک مجہول الحال شخص ہے اور اس سے تنہا زہری صاحب روایت کرتے ہیں بظاہر حال تو عبیداللہ بن عبداللہ بن ثعلبہ ایک فرضی نام معلوم ہوتا ہے جس کا کوئی مسمّیٰ نہ تھا جبھی تو اس سے صرف یہی ایک حدیث مروی ہے وہ بھی ابن شہاب زہری سے۔ تو پھر جو حدیثیں محض فرضی اور من گھڑت راویوں سے، یا مجہول الحال لوگوں سے مروی ہوں اور ان کا ہر طریق آحاد ہی آحاد ہو تو پھر ایسی تارعنکبوت والی حدیثوں سے کسی دینی عقیدے کا قائم کرنا، قرآن مجید کی کھلی ہوئی مخالفت نہیں تو کیا ہے؟ کیونکہ قرآن مبین نے ایک اصول بنا کر پیش کر دیا کہ ان الظن لا یغنی من الحق شیئاً۔ کیا ایسی ظنی من گھڑت روایتوں سے کوئی حقیقت ثابت کی جاسکتی ہے؟

اب صرف ایک حدیث ابو سعید والی رہ گئی جو صرف ابن ماجہ میں ہے۔ ان صاحب سے اس حدیث کو صرف ان کے پرانے شاگرد رشید عطیۃ العوفی روایت کرتے ہیں۔ عطیہ سے عبیداللہ بن الولید الوصافی ان سے ابو محمد المحاربی، ان سے ابوالحسن الطنافسی علی بن محمد بن اسحاق۔ اور ان سے ابن ماجہ صاحب السنن۔

ان میں سے اور کسی کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف ابو سعید اور عطیہ کو آپ جان لیں تو پھر سارے راویوں کی حیثیتوں پر خود روشنی پڑجائے گی اور اس حدیث کی حقیقت بھی روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گی۔ تو سنئے۔ یہ عطیہ بن سعد بن جنادہ العوفی الجدلی القیسی الکوفی ہیں۔ ابوالحسن ان کی کنیت ہے۔ ابن حجر تہذیب جلد ۷ صفحہ ۲۲۵ میں لکھتے ہیں کان یُعَدُّ مع شیعۃ اھل الکوفۃ یہ کوفی شیعوں میں گنے جاتے تھے۔ امام احمد بن حنبل نے کہا کہ مجھکو یہ خبر ملی ہے کہ عطیہ کلبی کے پاس جاتا ہے اور اس سے تفسیر وغیرہ پوچھتا ہے، اور کلبی کی کنیت خود اپنی طرف سے "ابو سعید" رکھ لی ہے اور روایت کرنے کے وقت کہتا ہے کہ قال ابو سعید ۔۔ اور ابو احمد الزبیری نے کہا کہ میں نے کلبی سے سُنا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ عطیہ نے میری کنیت ابو سعید رکھدی ہے ابن حبان نے کہا (جس کا خلاصہ یہ ہے) کہ کلبی کی حدیثیں یاد رکھتا تھا اور کلبی کی کنیت ابو سعید خود رکھدی تھی اور کہتا تھا کہ حدثنا ابو سعید تاکہ لوگ سمجھیں کہ ابو سعید خدری صحابی سے روایت کر رہا ہے۔ اس لئے عطیہ کو امام احمد بن حنبل، ابو داؤد، ساجی، یحییٰ بن سعید وغیرہم نے ضعیف غیر ثقہ اور لا یحتج بہ قرار دیا ہے۔

اور کلبی جس کا نام محمد بن السائب ہے جس کا ذکر گذشتہ قسطوں میں سے کسی قسط میں آچکا ہے کوفے کا بہت مشہور کذاب ہے کوفے میں دو بہت کذاب تھے۔ ایک کلبی دوسرا سُدّی۔ اور تفسیری روایتیں خصوصیت کے ساتھ زیادہ تر انھیں دونوں سے مروی ہیں۔ غیر تفسیری حدیثیں ان دونوں کی محدثین قبول نہیں کرتے۔ مگر ان کے بعض تلامذہ ان کے نام کو بدل بدل کر ان کی حدیثیں جو روایت کرتے ہیں ان کو جانتے بوجھتے بھی لے لیتے ہیں۔ جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ محدثین یہ خوب جانتے ہیں کہ عطیہ، کلبی کی

حدیثیں روایت کرتا ہے اور کہتا ہے حدثنا ابوسعید. کلبی کی کنیت ابوسعید نہیں تھی، مگر اس کی یہ کنیت اپنی طرف سے رکھ کر یہ اس طرح روایت کرتا ہے تاکہ لوگ سمجھیں کہ یہ ابوسعید خدری صحابی سے روایت کر رہا ہے۔

حضرت ابوسعید خدری کا زمانہ عطیہ نے پایا تو ہوگا کیونکہ حضرت ابوسعید خدریؓ کی وفات ۷۴ھ میں ہوئی جو اسّی سال کی عمر میں اور عطیہ مرا ہے ۱۱۱ھ میں۔ مگر ترجمہ ابن شہاب زہری میں میں لکھ چکا ہوں کہ جمع حدیث و روایت حدیث و تلاش احادیث کا رواج ابن شہاب زہری نے ۱۰۰ھ کے بعد قائم کیا ہے۔ اس لئے ۷۴ھ اور اس سے پہلے سے روایت احادیث کا عام دستور ہی نہ تھا اور نہ اس وقت محدثین طلب احادیث کے لئے شدِ رحال کیا کرتے تھے۔ اس لئے ۷۴ھ یا اس سے پہلے اس کا امکان بھی نہ تھا کہ عطیہ کوفہ سے مدینہ آکر حضرت ابوسعید خدری سے حدیثیں حاصل کرتا۔ غرض عطیہ کی یہ خاص بات جب خود ائمہ رجال و محدثین نے لکھ دی کہ یہ کلبی کی کنیت ابوسعید اپنی طرف سے رکھ کر اس کی من گھڑت حدیثیں روایت کیا کرتا تھا حدثنا ابوسعید کہہ کر تاکہ لوگ سمجھیں کہ یہ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت کر رہا ہے تو پھر اب اس حدیث کے افترا و بہتان ہونے میں کوئی شبہ ہی نہ رہا۔ کیونکہ یہ معلوم ہوگیا کہ یہ حدیث اور عطیہ کی ساری وہ حدیثیں جن کو وہ حدثنا ابوسعید کہہ کر روایت کرتا ہے وہ حضرت ابوسعید خدری کی حدیثیں نہیں ہوتیں بلکہ ابوسعید کلبی کوفی کذاب کی حدیثیں ہوتی ہیں۔

صحاح میں بس اتنی ہی حدیثیں نزول عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے متعلق تھیں جن کے راویوں کی تنقید آپ نے تین قسطوں میں سن لی۔ اب چوتھی قسط میں انشاء اللہ ان حدیثوں کے مضامین اور ان کے اختلاف و اضطراب اور تخالف و تضاد کو بیان کیا جائے گا تاکہ ان حدیثوں کے مضامین پر نظر ڈال کر بھی ان حدیثوں کی صحیح حیثیت کا آپ اندازہ فرما سکیں۔ وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب اللھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ۔

روزمرہ زندگی کے اہم مسائل و معاملات کے متعلق

ہماری بصیرت کے مطابق

قرآنی فیصلے

دور حاضر کی عظیم الشان کوشش جس میں روزمرہ زندگی کے تقریباً ساٹھ اہم مسائل و معاملات کے متعلق قرآن کی روشنی میں بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان مسائل و معاملات میں قرآن کا فیصلہ کیا ہے یہ کتاب آپ کو دوسرے تمام سہاروں سے بے نیاز کر دے گی۔ اسے فقہ کی کتاب نہ کہئے۔ اس سے قرآن کی بصیرت افروز راہ نمائی حاصل ہوگی۔

ضخامت چار سو آٹھ (۴۰۸) صفحات۔ قیمت مجلد چار روپے (علاوہ محصولڈاک)

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ کوئی روڈ۔ نزد پیراڈائز سنیما۔ کراچی

نہایت ضروری اعلان

بزم ہائے طلوعِ اسلام متوجہ ہوں

جنوری ۱۹۵۳ء کے طلوع اسلام میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ مختلف شہروں کے قارئین طلوع اسلام ایک دوسرے سے تعارف اور رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کریں چنانچہ اس سلسلہ میں مختلف مقامات سے جن حضرات نے اس کے لئے اپنے نام پیش کئے وہ گذشتہ اشاعتوں میں شائع کئے جاتے رہے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ اس تجویز کا وہ خیر مقدم نہیں ہوا جس کی ضرورت تھی، اور ابتک بہت سے مقامات ایسے باقی ہیں جہاں بزم طلوع اسلام قائم نہیں ہوسکی۔ بہرحال اس اہم تجویز کی طرف فوری توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

اس سلسلہ میں دوسرا قدم یہ تھا کہ جن جن مقامات پر قارئین طلوع اسلام ایک دوسرے سے متعارف ہو چکے اور رابطۂ باہمی قائم کرچکے ہیں وہ اپنے اپنے مقام پر "بزم طلوع اسلام" کے نام سے ایک ادارہ قائم کرلیں اور تمام قارئین کسی ایک مقام پر جمع ہو کر اپنے میں سے کسی ایک معتمد علیہ شخص کو اپنی بزم کا "ترجمان" منتخب کرلیں۔ بزم طلوع اسلام قائم ہو جانے اور ترجمان کا انتخاب ہو جانے کے بعد یہ ترجمان اپنے مقام کی بزم کے متعلق ادارہ طلوع اسلام کو اپنی رپورٹ بھیجدے اور آئندہ سے یہ ترجمان ادارہ طلوع اسلام سے براہِ راست رابطہ قائم رکھے۔

اسی سلسلہ میں تیسرا قدم یہ تھا کہ جہاں جہاں بزم طلوع اسلام قائم ہو چکی ہے وہاں بزم کی طرف سے ایک دارالمطالعہ قائم کیا جائے اور ضرورت ہو تو احباب کو مطالعہ کے لئے طلوع اسلام کا لٹریچر عاریۃً بھی مہیا کیا جائے۔

اب اسی سلسلہ کا چوتھا قدم یہ ہے کہ ہر مقام کی بزم طلوع اسلام کے ممبران اراکین طلوع اسلام کی آواز اور اس کے مسلک کے جو در حقیقت قرآن کریم کی دعوت ہی ہے عوام میں پھیلانے کیلئے عملی قدم اٹھائیں۔ طلوع اسلام کے لٹریچر اور طلوع اسلام کے پرانے پرچے لوگوں کو مطالعہ کیلئے دیئے جائیں اور جو لوگ ان کو پڑھ چکیں ان سے بعد میں بار بار ملاقات کی جائے اور ان سے تبادلۂ خیالات کیا جائے۔ ان کے شبہات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے اور نرمی و ملاطفت کے ساتھ ان کے شکوک و شبہات کو دور کیا جائے۔ اس سلسلہ میں جہاں جہاں بزم طلوع اسلام کے پاس پرانے پرچے موجود نہ ہوں وہ ہم سے براہ راست منگا سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم ہر ممکن تعاون کریں گے اور بزم ہائے طلوع اسلام کو طلوع اسلام کے پرانے پرچے (جو موجود ہونگے) نصف قیمت پر مہیا کردیں گے۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ کوی روڈ۔ نزد پیراڈائز سینما۔ کراچی

حلقۂ معاونین طلوعِ اسلام

طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت جولائی، اگست اور ستمبر ۱۹۵۳ء میں ان ایک سو چار حضرات کے نام شائع ہو چکے ہیں جنھوں نے ہماری دعوت پر لبیک کہا اور معاونین کے حلقہ میں شامل ہوگئے۔ اس کے بعد جو دیگر احباب حلقۂ معاونین میں (۲۱ ستمبر تک) شامل ہوئے ہیں ان کے اسمائے گرامی شکریہ کے ساتھ درج ذیل کئے جاتے ہیں۔ معاونین کی کل تعداد اس وقت تک ایک سو چونتیس ۱۳۴ ہوئی ہے جو حضرات ابھی تک اس حلقہ میں شامل نہیں ہوئے وہ خود غور فرمائیں کہ قرآنی فکر اور نظام کی اشاعت کی اتنی بڑی اسکیم اس قلیل سی رقم کے ساتھ کس حد تک آگے بڑھ سکے گی۔ اسکیم یہ ہے کہ آپ ایک سو روپیہ کی رقم (یکمشت یا چار مساوی اقساط میں) ارسال فرمادیں۔ آپ کو رسالہ طلوعِ اسلام اور ادارہ کی طرف سے شائع ہونے والی تمام کتابیں اسوقت تک بلاقیمت پیش کی جاتی رہیں گی جبتک آپ کی سو روپے کی رقم پوری نہ ہوجائے اگر خدانخواستہ یہ سلسلہ بند کردینا پڑا تو آپ کی بقایا رقم واپس کردی جائے گی۔ ہمیں کم ازکم اس قسم کے ایک ہزار معاونین کی ضرورت ہے توقف نہ کیجئے۔ آپ کو کسی قسم کا بھی خسارہ نہیں رہے گا اور آپ کی مدد سے قرآنی فکر اور نظام کی اشاعت کا انتظام ہوجائے گا۔

فہرست معاونین خصوصی ادارۂ طلوعِ اسلام

لاہور (۱۰۵) خانبہادر عبدالرحمٰن صاحب آئی ایس سی 13/A ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

(۱۰۶) مولوی محمد ابراہیم صاحب سشن جج ریٹائرڈ۔ ۱۰ ٹیپ روڈ ″

(۱۰۷) محمد امیر صاحب متصل مسجد درہاٹہ۔ مکوہ محلہ محمد گنج گڑھی شاہو ″

(۱۰۸) عبدالحی صاحب معرفت یونیورسل ڈیزل کمپنی۔ ۹ بیڈن روڈ ″

کیمبلپور (۱۰۹) چودھری محمد اقبال صاحب کیمبل پور

سیالکوٹ (۱۱۰) وزیر محمد صاحب بورڈر پولیس ضلع سیالکوٹ

(۱۱۱) عبدالرحیم خان صاحب۔ علامہ اقبال چوک۔ سیالکوٹ

(۱۱۲) معبوث اللہ خانصاحب ″ ″

(۱۱۳) روشن خانصاحب معرفت بزم طلوعِ اسلام ″

(۱۱۴) چودھری محمد صفدر علی خانصاحب کالج روڈ ″

(۱۱۵) جناب ترجمان صاحب بزم طلوعِ اسلام ″

(۱۱۶) محمد سبحانی صاحب اے ایس او کلر وونگ فیکٹری ″

مردان (۱۱۷) ڈاکٹر عبدالحنان صاحب۔ ڈاکخانہ و موضع زروبی تحصیل صوابی ضلع مردان

(۱۱۸) شیخ محمد یعقوب صاحب مہاجر شام گنج مردان

(۱۱۹) شاہ نظر صاحب ایجنٹ برماشیل پٹرول پمپ ″

کراچی (۱۲۰) چوہدری شیر محمد صاحب۔ وہائٹ ہاؤس کراچی

(۱۲۱) محمد اقبال صاحب معرفت دوست محمد اینڈ کمپنی نیکل روڈ۔ کراچی

حیدرآباد سندھ (۱۲۲) عبدالعزیز صاحب معرفت عبداللہ محمد ایچ ڈی ڈسپنسری میونسپل ہسپتال ٹنڈو ولی محمد حیدرآباد۔ حیدرآباد سندھ

(۱۲۳) اے ایچ جتوئی صاحب۔ اسسٹنٹ پروفیسر یونیورسٹی آف سندھ ″

چارسدہ (۱۲۴) شیر محمد خانصاحب انسپکٹر سنٹرل ایکسائز۔ چارسدہ

آزاد کشمیر (۱۲۵) محمد نعیم انصاری صاحب۔ سول سرجن میرپور (براہ جہلم)

سعودی عرب (۱۲۶) محمد بشیر الدین خانصاحب پوسٹ بکس ۲۰۱ انٹرمیڈیٹ کیمپ آرامکو۔ داہران۔ سعودی عرب

پشاور (۱۲۷) حاجی خیر محمد پراچہ جنرل مرچنٹ اینڈ کمیشن ایجنٹ۔ کٹڑہ مسجد

لاڑکانہ (۱۲۸) عبدالمجید صاحب۔ چوہان ڈویژنل اکاؤنٹنٹ نوروران۔ دادو ڈویژن

(۱۲۹) ڈاکٹر نجم الدین عباسی صاحب ایم بی بی ایس میڈیکل اسسٹنٹ سول ہسپتال لاڑکانہ

راولپنڈی (۱۳۰) صوبیدار محمد بشیر چیمہ صاحب راولپنڈی

(۱۳۱) عزیز احمد قریشی آوڑہ عثمان زادہ براستہ دولتالہ ضلع راولپنڈی

گوجرانوالہ (۱۳۲) عبدالعزیز صاحب ڈسٹرکٹ انجنیر گوجرانوالہ

لائلپور (۱۳۳) امیرالدین احمد صاحب ایڈووکیٹ۔ کچہری بازار

کوئٹہ (۱۳۴) محمد شریف صاحب اسسٹنٹ فارسٹ آفیسر سنٹرل سائل کنزرویشن۔ آرگنائزیشن۔ کوئٹہ

اسلامی نظام

دورِ حاضر کی ایک بلند پایہ کتاب

جس میں بتایا گیا ہے کہ ایک اسلامی مملکت کے نظام اور آئین کے بنیادی اصول کیا ہیں اور وہ نظام آج کس طرح قائم ہو سکتا ہے۔ اس میں محترم پرویز صاحب اور علامہ محمد اسلم صاحب جیراجپوری کے وہ اہم مقالات شامل ہیں جنہوں نے قوم کے سنجیدہ طبقے کے سامنے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ضخامت ۱۸۴ صفحات۔ کتابت وطباعت دیدہ زیب۔ کاغذ سفید گلیزڈ۔ قیمت مجلد مع گرد پوش صرف دو روپے۔ علاوہ محصولڈاک۔

قرآنی دستورِ پاکستان

آئینی جدوجہد کے سلسلہ میں ادارۂ طلوع اسلام کی پیشکش

پاکستان کی آئینی جدوجہد کے سلسلہ میں ادارۂ طلوع اسلام کی طرف سے قرآن کی روشنی میں مرتب کردہ مسودہ قرارداد مقاصد اور مسودۂ بنیادی اصولوں کی رپورٹ جو حکومت پاکستان کے اعلان کے جواب میں ادارہ کی طرف سے حکومت کو بھیجے گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی حکومت کی طرف سے پاس کردہ قرارداد مقاصد اور بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی پہلی رپورٹ پر قرآن کی روشنی میں تنقید۔ مولوی صاحبان کی طرف سے پیش کردہ بائیس نکات کا تجزیہ۔ اسلامی جماعت کے دستوری سفارشات اور ان کے فکر و نظر کے تضادات پر تبصرہ۔ غرض اس کتاب میں آئینی جدوجہد کے سلسلہ میں وہ سب کچھ آ گیا ہے جسے معلوم کرنے کی آپ کو ضرورت ہے۔

ضخامت ۲۲۴ صفحات۔ کتابت وطباعت دیدہ زیب۔ کاغذ عمدہ

قیمت مجلد مع گرد پوش دو روپے آٹھ آنے علاوہ محصولڈاک

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ کوی روڈ۔ نزد پیراڈائز سنیما۔ کراچی

ادارۂ طلوع اسلام کی تازہ پیشکش

جشن نامے

سیکڑوں اور دکھوں کا مرقع۔ نشتروں اور مرہموں کا مجموعہ۔ ہماری چھ سالہ آزادی کی زندگی پر مخلصانہ تبصرہ اور ہمارے دکھوں کا مشفقانہ مداوا۔ اردو لٹریچر میں اس نوعیت کی دوسری کتاب نہیں ملے گی۔

فہرست عنوانات ملاحظہ کیجئے

پنکھڑیاں

- انسانیت کی موت۔
- اے چشم اشکبار ذرا دیکھ تو سہی / یہ گھر جو بہہ رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو
- جب ہماری حکومت آئی تو
- ذرا سوچئے۔
- پاکستانی ہٹے۔
- ملاح کی اصلاح۔
- ہماری رفتار ترقی۔
- آگ بزداوالا دا بزمیب ہے فروز ہے / کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے
- قوم کے غم میں

- لیڈرانیاں۔
- مجاہدانہ رنگینیاں۔
- آدمی نہیں ملتے ۔
- رکھشا والا۔
- چائے کا دور
- چائے کا دور (تصویر کا دوسرا رخ)
- شاعری نے مار ڈالا اس قوم کو
- اتاترک کا آخری پیغام
- ہر شخص چاہتا ہے کہ
- متنوی بیاد کشمیر کی یاد میں تفریحات
- پارٹیاں
- اسلامی حکومت
- رام داس

- تقسیم کے ہو کر
- مادر پدر آزادی۔
- مجبوریاں۔۔
- پارٹیاں۔
- مخلل نمائش
- پاکستان کا نیا کلچر
- تمام شہر ہے دو چار دس کی بات نہیں
- رکھشا والا
- اہم تبدیلی
- نظریۂ اضافیت
- **جشن نامے**
- جشن آزادی ۱۹۴۹ء

- نذر عقیدت۔
- ۱۵ر اگست۔
- جشن آزادی ۱۹۴۹ء
- ۱۵ر اگست کا پیغام
- جشن آزادی
- جشن آزادی ۱۹۵۰ء
- ۱۵ر اگست کا پیغام
- جشن آزادی
- جشن آزادی ۱۹۵۱ء
- جشن آزادی ۱۹۵۲ء
- یہ ہمارا خواب تھا
- یہ خواب کی تعبیر ہے
- جشن آزادی

ضخامت ۲۵۶ صفحات۔ مجلد معہ گردپوش ۔ قیمت اڑھائی روپے

بہت جلد طلب کیجئے کیونکہ کاغذ کی کمیابی کی وجہ سے کتاب محدود تعداد میں چھاپی گئی ہے۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام ۔ کوئی روڈ (نزد پیراڈائز سینما) کراچی

ادارۂ طلوعِ اسلام کی مطبوعات ایک نظر میں

معراجِ انسانیت | ترجمانِ حقیقت جناب پرویز کا قلم اور سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام، خود قرآن کے آئینہ میں۔ جو اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور نہایت کامیاب۔ ابتداء میں قریب پونے دوسو صفحات پر دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر پھر عنوانات کے ماتحت سیرت حضور سرورِ کائنات جس میں دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں بڑے سائز کے قریباً نو سو صفحات۔ کاغذ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ۔ جلد مضبوط و حسین گردپوش مرصع و دیدہ زیب ٹائیٹل اور صحیح بہار کے عنوانات منقش ورنگین قیمت بیس روپے (علاوہ محصولڈاک)

نوادرات | علامہ حافظ محمد اسلم صاحب کے نادر مضامین کا قابلِ قدر مجموعہ۔ ضخامت چارسو صفحات قیمت صرف چار روپے (علاوہ محصولڈاک)

اسلامی نظام | دورِ حاضر کی ایک بلند پایہ کتاب جس میں بتایا گیا ہے کہ ایک اسلامی مملکت کے نظام اور آئین کے بنیادی اصول کیا ہیں۔ وہ نظام آج کس طرح قائم ہو سکتا ہے۔ اس میں محترم پرویز صاحب اور علامہ محمد اسلم جیراجپوری کے وہ مقالات شامل ہیں جنھوں نے قوم کے سنجیدہ طبقہ کے سامنے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات مجلد مع گردپوش قیمت دو روپے (علاوہ محصولڈاک)

قرآنی دستورِ پاکستان | آئینی جدوجہد کے سلسلہ میں ادارۂ طلوعِ اسلام کی پیشکش۔ قرآن کی روشنی میں مسودات قراردادِ مقاصد و بنیادی اصول و حقوق جو حکومت کے اعلان کے جواب میں بھیجے گئے۔ ساتھ ہی حکومت کی جانب سے پاس کردہ قراردادِ مقاصد اور بنیادی اصولوں کی پہلی رپورٹ پر قرآن کی روشنی میں تنقید۔ مولوی صاحبان کے بائیس نکات کا تجزیہ۔ اسلامی جماعت کی دستوری سفارشات پر تبصرہ۔ ضخامت ۲۲۴ صفحات بسرمع گردپوش قیمت دو روپے آٹھ آنے (علاوہ محصولڈاک)

اسبابِ زوالِ اُمت (پرویز) | دورِ حاضرہ کی انقلاب آفریں کتاب۔ مختصر مگر ہماری ہزار سالہ تاریخ کا نچوڑ۔ جس نے قوم کے سنجیدہ تعلیمیافتہ طبقہ کے قلب و نگاہ میں انقلاب پیدا کر دیا۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ زندگی میں پہلی مرتبہ صحیح طور پر بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور اس کا علاج کیا؟ ضخامت ۱۵۰ صفحات مجلد طلائی گردپوش قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (علاوہ محصولڈاک)

تین اہم عنوانات | ملّا کے مذہب کے عجیب و غریب حقائق مثلاً (۱) تبدیل مذہب کرنے والوں کو قتل کر دیا جائے گا (۲) غلام اور لونڈیاں بے حد و نہایت بلا نکاح حرم سراؤں کی زینت بنائی جا سکیں گی (۳) یتیم پوتوں کو وراثت سے محروم رکھا جائے گا۔ قرآن کی روشنی میں ملّا کے خود ساختہ مذہب کا ابطال اور ان تینوں مسائل کا حل اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمائیے۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

سلیم کے نام خطوط | محترم پرویز صاحب کے قلم سے۔ ہمارے نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق جس قدر شکوک پیدا ہوتے ہیں ان کا نہایت شگفتہ شاداب اور سائنٹفک انداز میں تسکین بخش جواب۔ عقائد و نظریات جیسے خشک اور نازک مسائل پر اس عمدگی سے بحث کی گئی ہے کہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ہم کس خشک فلسفیانہ بحث کو پڑھ رہے ہیں۔ باتوں باتوں میں وہ دقیق اور معرکہ آرا مسائل حل کر کے رکھ دیئے گئے ہیں جنھیں ضخیم مجلدات میں بھی حل نہیں کیا جا سکا تھا۔ ضخامت بڑے سائز کے ۵۰۴ صفحات۔ مجلد مع حسین گردپوش۔ قیمت چھ روپے (علاوہ محصولڈاک)

قرآنی فیصلے (ہماری بصیرت کے مطابق) | دورِ حاضرہ کی ایک اہم کوشش جس میں روزمرہ زندگی کے تقریباً ساٹھ اہم مسائل و معاملات کے متعلق قرآن کی روشنی میں بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان مسائل اور معاملات میں قرآن کا کیا فیصلہ ہے۔ یہ کتاب آپ کو دوسرے سہاروں سے بے نیاز کر دے گی۔ ضخامت ۴۰۸ صفحات۔ قیمت مجلد مع گردپوش چار روپے (علاوہ محصولڈاک)

جشن نامے | بلند حقائق کا مجموعہ اور عبرت و موعظت کا مرقع۔ ایسے ایسے عنوانات جنھیں پڑھ کر بیک وقت آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں آنسو آجائیں۔ طنز و تنقید کے ایسے گہرے نشتر اور درد کے ایسے خونچکاں منظر شاید ہی کہیں مل سکیں۔ یہ کتاب ہمارے چھ سالہ دورِ آزادی کی سمٹی ہوئی تاریخ ہے۔ ضخامت ۲۵۶ صفحات قیمت مجلد مع گردپوش دو روپے آٹھ آنے (علاوہ محصولڈاک)

ادارۂ طلوعِ اسلام۔ کوئی روڈ (نزد پیراڈائز سینما) کراچی

طلوع اسلام کی نئی پیشکش

جشن نامے

یہ ایک عجیب و غریب کتاب ہے جس کی مثال ہمارے لٹریچر میں کہیں نہیں ملیگی۔ آزادی سے کیا مفہوم ہے جشن کسے کہتے ہیں جشن آزادی کیا ہوتا ہے طلوع اسلام نے ہر سال جشن آزادی کی تقریب پر کیا کیا مشورے دئے اور جشن منانے والوں کی نگاہوں کا رخ کس طرف پھیرا، یہ سب کچھ آپ کو اس نئی کتاب میں ملیگا۔ جس کا نام ہے۔

جشن نامے

یہ کتاب بلند حقائق کا مجموعہ اور عبرت و موعظت کا مرقع ہے۔ شروع میں قریب پچاس عنوانات ایسے ہیں جنہیں پڑھکر بیک وقت آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں آنسو آجائیں طنز و تنقید کے ایسے گہرے نشتر اور اثر و درد کے ایسے خونچکاں منظر شاید ہی کہیں مل سکیں۔ کتاب کیا ہے ہمارے چھ سالہ دور آزادی کی سمٹی ہوئی تاریخ ہے۔

ضخامت ۲۰۶ صفحات قیمت مجلد مع گردپوش دو روپے آٹھ آنے۔

بہت جلد منگا لیجئے کیونکہ کتاب محدود تعداد میں چھپی ہے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام
کوی روڈ (صدر) کراچی

REGD. NO. S. 1089

ترجمان حقیقت محترم پرویز صاحب کے قلم سے

سلیم کے نام خطوط

ہمارے نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق جسقدر شکوک پیدا ہوتے ہیں ان کا نہایت شگفتہ شاداب اور سائنٹفک انداز میں تسکین بخش جواب

ان خطوط میں ملت کے اس نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو مخاطب کیا گیا ہے جو مشرق و مغرب کے تصادم کے بعد دور ملوکیت کے وضع کردہ غلط مذہبی تصورات سے متنفر ہوتے ہوتے اسلام اور اس کے سرچشمہ حیات، قرآن سے بھی ہاتھ دھو چلا تھا۔عقائد و نظریات جیسے خشک اور نازک مسائل پر اس عمدگی سے بحث کی گئی ہے کہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ہم کسی خشک فلسفیانہ بحث کو پڑھ رہے ہوں ۔ باتوں باتوں میں وہ دقیق اور معرکہ آراء مسائل حل کرکے رکھ دئے گئے ہیں جنہیں ضخیم مجلدات میں بھی حل نہیں کیا جاسکا تھا ۔ یہ خطوط ملک کے گوشہ گوشہ سے خراج تحسین وصول کرچکے ہیں۔قرآن کی روشنی اور محترم پرویز صاحب کا بصیرت افروز قلم۔اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں اس مجموعہ میں وہ خطوط بھی شامل ہیں جو طلوع اسلام میں شائع ہوچکے ہیں اور وہ بھی جو ابتک کہیں شائع نہیں ہوئے۔

کتاب بڑے سائز کے قریب سوا چار سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔کتابت و طباعت دیدہ زیب ۔ کاغذ سفید ۔گرد پوش مصور مشرق جناب چغتائی کے حسین قلم کا مرقع ۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود قیمت صرف چھ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ناظم ادارہ طلوع اسلام
کوی روڈ (صدر) ۔ کراچی

Only Title Printed at Mueid Art Press, Thathai Compound, Bunder Rd., Karachi and Text at Adabi Press, Robson Road, Karachi. Published by Said Ahmed from Tulu-e-Islam Office Kawi Road, Karachi.